غیر مقلدیت پر لاجواب رسائل کا قیمتی مجموعہ

رسائلِ اعظمی

تالیفات
محدثِ جلیل امیر الہند
حضرت مولانا ابو المآثر حبیب الرحمن الاعظمی
رحمۃ اللہ علیہ

① نصرۃ الحدیث
② تحقیقِ اہلِ حدیث
③ رکعاتِ تراویح
④ انساب و کفاءت کی شرعی حیثیت
⑤ الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلاقات المجموعۃ

زمزم پبلشرز

غیر مقلدیت پر لاجواب رسائل کا قیمتی مجموعہ

رسائلِ اعظمی

اُمتِ مسلمہ جن مسائل پر متفق تھی اُن میں غیر مقلدین کے رخنہ ڈالنے
اور انتشار پیدا کرنے کے جواب میں بہتر علمی تحریرات کا مجموعہ

① نصرۃ الحدیث
② تحقیقِ اہلِ حدیث
③ رکعاتِ تراویح
④ انساب و کفاءت کی شرعی حیثیت
⑤ الأعلام المرفوعة فی حکم الطلاقات المجموعة

تالیفات

امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن المحدث الاعظمی
نور اللہ مرقدہٗ

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اُردو بازار کراچی

مؤلف کے صاحبزادگان کی اجازت سے شائع کی گئی

کتاب کا نام ــــ رسائلِ اعظمی

تاریخ اشاعت ــــ مئی ۲۰۰۹ء

مطبع ــــ احباب زمزم پبلشرز

ناشر ــــ زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی
فون: 021-2760374 - 021-2725673
فیکس: 021-2725673
ای میل: zamzam01@cyber.net.pk
ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- دارالھدیٰ اردو بازار کراچی۔ فون: 2726509
- دارالاشاعت، اُردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ سرکی روڈ
- مکتبہ علمیہ، علوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

Madrassah Arabia Islamia
1 Azaad Avenue P.O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel : 00(27)114132786

AL FAROOQ INTERNATIONAL
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel : 0044-116-2537640

ISLAMIC BOOK CENTRE
119-121 Halliwell Road, Bolton Bl1 3NE
U.S.A
Tel/Fax : 01204-389080

فہرست مضامین

پیش لفظ ۱۷

امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر تعارف ۱۹

نصرۃ الحدیث ۲۱

مقدمہ طبع ثانی ۲۴

فتنہ انکار حدیث ۲۵

انکار حدیث کا محرک وسبب ۲۵

کتابت حدیث کی تاریخ ۲۷

عہد نبوی میں حدیث کی کتابت ۲۷

عہد نبوی میں متعدد صحابہ کا حدیث لکھنا ۲۹

عہد نبوی کی کتاب الصدقہ ۳۰

عہد نبوی کا ایک اور نوشتہ ۳۱

فتح مکہ کا خطبہ ۳۱

کتاب عمرو بن حزم ۳۱

صحیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ۳۲

عہد صحابہ میں حدیث کی کتابت ۳۳

عہد تابعین میں کتابت حدیث ۳۵

تبع تابعین کے عہد میں حدیث کی کتابت ۳۸

چغتائی کا دوسرا دعویٰ ۴۱

حفظ حدیث کا اہتمام بلیغ ۴۲

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ۴۲

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم ۴۴

عہد تابعین رحمۃ اللہ علیہم ۴۶

صحابہ وتابعین کا غیر معمولی حافظہ ۴۷
تابعین کے بعد کے طبقے ۴۹
روایت میں محدثین کی بے نظیر احتیاط ۵۶
محدثین پر سلطنت کی ہوا خواہی کا الزام ۶۰
تمہید ۶۸
"حق گو" کے رسالہ پر اجمالی تبصرہ ۶۸
قرآن کریم اور حدیث ۶۸
رسول اللہ ﷺ معلم قرآن تھے ۶۹
تعلیم کتاب کا مطلب ۷۱
رسول اللہ ﷺ کا مخصوص فہم قرآن ۷۲
فہم قرآن کے لئے شرح رسول کی روشنی درکار ہے ۷۳
آنحضرت ﷺ کی شرحِ قرآن ہی کا نام حدیث وسنت ہے ۷۴
حجیت حدیث کے اور دلائل ۷۵
رسول علیہ السلام کی حرام کی ہوئی اشیاء بھی اسی طرح حرام ہیں جس طرح خدا کی حرام کی ہوئی ۸۱
آنحضرت ﷺ کی تحلیل وتحریم کا ذکر قرآن کی دوسری آیت میں ۸۲
آنحضرت ﷺ کے افعال کی پیروی کا حکم بھی قرآن نے دیا ہے ۸۳
انکار حدیث ۸۳
منکرین حدیث کے وسوسوں کا دفعیہ ۸۴
غیر مسلموں کی شہادتیں ۸۵
مسلمانوں کا ناز خاک میں مل جائے گا ۸۶
مسلمانانِ سلف پر سخت حملہ ۸۸
منکرین حدیث کا یہ اقدام نہایت خطرناک ہے ۹۰
انکار حدیث کا لازمی نتیجہ انکار قرآن ہے ۹۱
منکرین حدیث کے رسالہ مذکورہ پر تفصیلی تبصرہ ۹۵

روافض کا عقیدۂ تحریف قرآن ۹۶
''حق گو'' کی پیش کردہ روایات کا مفہوم ۹۷
ایک اعتراض کا جواب ۹۸
اختلاف قرأت کی حیثیت ۹۹
تمثیل ۹۹
نسخ کی تعریف اور اس کا ثبوت ۹۹
تحریف و نسخ کا فرق ۱۰۴
انبیاء کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا ۱۰۵
حضرت صدیق اکبر ؓ سے سیدۃ النساء کا ناراض ہونا ۱۰۶
حضور ﷺ کے بعد کون لوگ مرتد ہوئے ۱۰۷
آنحضرت ﷺ یہودیوں کی خرافات کو سن کر وحی الٰہی کی طرح پیش کرتے تھے ۱۰۹
عیسائی اور یہودی مذہب کی بکثرت تردید قرآن و حدیث میں ۱۱۰
ایک اعتراض کا جواب ۱۱۱
قرآن پہلی آسمانی کتابوں کا مصدق ہے ۱۱۱
معترض کی ناسمجھی ۱۱۲
وحی غیر متلو کی حقیقت ۱۱۲
اس کا ثبوت قرآن مجید سے ۱۱۳
''حق گو'' کی عقلمندی کا نمونہ ۱۱۳
عذاب قبر کا ثبوت قرآن مجید سے ۱۱۴
عذاب قبر کے خلاف قرآن میں ایک لفظ بھی نہیں ۱۱۵
''حق گو'' کا بے ثبوت دعویٰ ۱۱۵
''حق گو'' کی نقل کردہ دوسری حدیث ۱۱۵
''حق گو'' کے مدعائے باطل سے حدیث مذکور کی بے تعلقی ۱۱۶
حدیث مذکور میں مشرکین اور نصاریٰ کا رد ۱۱۶
''حق گو'' اور اس کے ہم اعتقاد دوگونہ عذاب میں ۱۱۷

مخالفین کے اعتراضات کی بنیاد صرف بغض وعناد پر ہے ۱۱۸
انکار حدیث کے بعد بھی معترضین کا منہ بند نہیں ہوسکتا ۱۱۸
حدیث مذکور کو غلط کہنے کی دوسری وجہ اور اس کا جواب ۱۱۹
تیسری وجہ اور اس کی تغلیط ۱۱۹
’’حق گو‘‘ کی تاریخ سے افسوسناک بے خبری ۱۲۱
ہویٰ کے معنی ۱۲۲
حدیث زیر بحث اور آیت مذکورہ کی تشریح ۱۲۴
صاحب سیرۃ حلبی پر افتراء ۱۲۸
آنحضرت ﷺ مسحور کئے جاتے ہیں ۱۲۸
’’حق گو‘‘ کے شاعرانہ تخیلات ۱۲۹
قاہر سوالات ۱۳۰
تاریخی واقعات قیاس سے ثابت نہیں ہوسکتے ۱۳۱
حدیث سحر پر ’’حق گو‘‘ کے اعتراضات ۱۳۲
جوابات ۱۳۲
حضور ﷺ کو مسحور کہنے سے کفار کا کیا مقصد تھا ۱۳۳
سحر کا اثر حضور ﷺ کی عقل اور قوت ادارک ویقین پر قطعاً نہیں ہوا ۱۳۴
سحر کا اثر علاوہ سطحی ہونے کے عارضی تھا ۱۳۵
واقعہ سحر حضور کے نبی ہونے کی روشن دلیل ہے ۱۳۵
ساحر کی ناکامی ونامرادی ۱۳۶
انبیاء عوارض جسمانی سے مبرا نہیں ہوتے ۱۳۶
’’حق گو‘‘ کا جہل ۱۳۷
سورۂ فلق اور واقعۂ سحر ۱۳۷
’’حق گو‘‘ کی قرآن مجید سے بے تعلقی ۱۳۸
’’حق گو‘‘ کا جدید قرآن ۱۳۹
شیطان آنحضرت ﷺ کے دل ومنہ میں جگہ پاتا ہے (نعوذ باللہ) ۱۳۹

معجزۂ شق صدر ۱۴۰
تلک الغرانیق العلی پر بحث ۱۴۱
رسول اللہ ﷺ مکر و خدع سے اپنے دشمنوں کو قتل کرا دیتے تھے ۱۴۲
اس روایت پر ''حق گو'' صاحب کی جرح اور اس کا جواب ۱۴۴
''حق گو'' صاحب کی دوسری جرح ۱۴۵
بے علمی کا دوسرا مظاہرہ ۱۴۶
''حق گو'' صاحب کی تاریخ دانی ۱۴۷
کعب بن الاشرف کے قتل کا سبب ۱۴۸
بنو نضیر کی جلاوطنی کس سنہ میں ہوئی ۱۴۸
خلفائے بنوامیہ و بنی عباس پر تبرا بازی ۱۴۹
آنحضرت ﷺ کا عکل و عرینہ کی قوم سے نہایت عذاب اور بے دردی سے انتقام لینا اوائل صدی کے مسلمانوں پر حملہ ۱۵۱
کیا یہ قرآن کا انکار نہیں ہے؟ ۱۵۲
دشمنان اسلام کی بدگوئیوں کی صدائے بازگشت ۱۵۲
''حق گو'' اپنی اصل شکل میں ۱۵۴
''حق گو'' کو چیلنج ۱۵۴
گستاخانہ اعتراضات کا دندان شکن جواب ۱۵۴
اس عنوان کے ماتحت ''حق گو'' صاحب کی دوسری زہر افشانی ۱۵۹
''حق گو'' کے افتراؤں کا جواب بروئے احادیث ۱۵۹
حضور ﷺ کا عفو عام اور کرم بے پایاں ۱۶۱
توریت کی شہادت ۱۶۱
عرنیین کا واقعہ ۱۶۲
امر اوّل کا جواب ۱۶۳
عیسائی اپنے گھر کی خبر لیں ۱۶۳
امر ثانی پر گفتگو ۱۶۴

سزائے ارتداد اور قرآن ۱۶۵
راہزنوں کی سزا ۱۶۶
عرینین کی سفاکیاں ۱۶۶
مثلہ کرنے سے حضور ﷺ کی ممانعت ۱۶۷
امر ثالث پر بحث ۱۶۸
امر رابع پر گرفت ۱۶۹
امر خامس پر نظر ۱۶۹
آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ۹ سال کی عمر میں نکاح کرتے ہیں ۱۷۰
جواز نکاح کے لئے بلوغ شرط نہیں ۱۷۰
یہ آیت ‘‘حق گو’’ کے مدعا کے خلاف ہے ۱۷۱
ایجاب و قبول سرپرستوں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے ۱۷۳
‘‘حق گو’’ کی دورنگی ۱۷۴
خلاف عادت واقعات ۱۷۴
اس حدیث کے غلط ہونے کی پہلی وجہ ۱۷۵
‘‘حق گو’’ کی ‘‘اعلیٰ قابلیت’’ کے چند نمونے ۱۷۶
اکمال کی عبارت پر بحث ۱۷۷
دوسری وجہ ۱۷۸
‘‘حق گو’’ کے تاریخی معلومات کی رسوائی ۱۷۸
تیسری وجہ ۱۷۹
اس کا جواب ۱۸۰
چوتھی وجہ ۱۸۱
اختلاف روایات سے کوئی فن بے اعتبار نہیں ہو سکتا ۱۸۱
‘‘حق گو’’ صاحب کے ملحدانہ بیانات ۱۸۲
صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت حدیث اور ان کا حدیث کے سامنے سرتسلیم خم کرنا ۱۸۳
روایت حدیث میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی احتیاط ۱۸۴

مغازی پر حملہ ۱۸۵
مغازی کی طرف سب سے پہلے کس نے توجہ کی؟ ۱۸۶
“حق گو” دشمنان اسلام کی صف میں ۱۸۶
اسلامی قوانین کی اکملیت ۱۸۷
شریعت اسلامیہ کی توہین ۱۸۹
ابن خلدون کی عبارت کے ترجمہ میں “حق گو” صاحب کی خیانت ۱۹۰
یہود و نصاریٰ سے مسائل اخذ کرنے کی ممانعت حدیث میں ۱۹۲
“حق گو” صاحب کی خبط الحواسی ۱۹۴
تصویر کی حرمت و حلت کا مسئلہ ۱۹۵
“حق گو” کی شرم ناک غلط بیانی ۱۹۶
ماکول اللحم جانوروں کی بحث ۱۹۷
“حق گو” کی قرآن مجید پر تعریض ۱۹۷
قرآن مجید پر افتراء ۱۹۸
بنی اسرائیل پر طیبات کے حرام ہونے کی وجہ ۱۹۹
‘حق گو’ نسخ کا قائل ہوگیا ۱۹۹
“مثنا” کا صحیح معنی ۲۰۰
“حق گو” صاحب کی اختلاف بیانی ۲۰۰
“حق گو” کی ایک عجیب کاروائی ۲۰۰
قرآن میں شہیدوں کا ذکر ۲۰۱
اختلاف بیانی کی دوسری مثال ۲۰۲
تیسری مثال ۲۰۲
“حق گو” صاحب کا انکار حدیث کے باوجود حدیثوں سے استدلال ۲۰۳
“حق گو” تحریف قرآن کا بھی قائل ہے ۲۰۴
مذہبی و اسلامی غیرت کا خون ۲۰۵
پانچ نمازوں اور تیس روزوں کا ملحدانہ انکار ۲۰۷

قرآن مجید میں تیس روزوں کا حکم ۲۰۷

پانچ نمازوں کا قرآنی حکم ۲۰۷

عمل متواتر اور قول متواتر میں کیا فرق ہے؟ ۲۰۹

تواتر کی اہمیت ۲۰۹

’’حق گو‘ صاحب کی بیباکانہ غلط بیانیاں ۲۱۰

’’حق گو‘ کی کم علمی اور ناواقفیت کی چند مثالیں ۲۱۲

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف حافظ حدیث تھے ۲۱۳

صوفیائے کرام رحمۃ اللہ علیہ پر تہمت ۲۱۴

صوفیائے کرام کی دشمنی میں قرآن کا انکار ۲۱۵

موضوعات کی اشاعت کے خلاف حضرات محدثین اور خلفاء کی مساعی جمیلہ ۲۱۵

ایڈیٹر اہل حدیث امرتسر سے ایک شکایت ۲۱۸

تحقیق اہلحدیث ۲۲۱

عرض ناشر ۲۲۲

حدیث کی نئی تعریف ۲۲۴

جعلی حدیث سے استناد ۲۲۵

اصحاب الحدیث کی صحیح مراد ۲۲۶

صحابہ کے اہل حدیث ہونے کا مطلب ۲۲۷

جعلی حدیث کے بعد خواب سے استناد ۲۲۹

ایک لطیفہ ۲۳۱

تابعین واتباع تابعین ۲۳۶

ائمہ اربعہ ۲۳۷

بڑے پیر ۲۳۹

افغانستان ۲۴۰

ہندوستان ۲۴۲

تقسیم مذاہب ۲۴۲
اشاعت بزور حکومت ۲۴۲
مذہبی عصبیت ۲۴۴
ابتلاء اہلحدیث ۲۴۶
اختلاف بیان ۲۴۸
ابن تیمیہ ۲۴۹
مذہبی جنگ ۲۵۰
بہتانات ۲۵۰
مسلک اہل حدیث ۲۵۲
قیاس واجماع ۲۵۷
اہلحدیث اپنے گھر کی خبر لیں ۲۶۰
اجماع صحابہ کے علاوہ ہر اجماع سے انکار ۲۶۳
دفع ایراد ۲۶۳
دفع ایراد کے بجائے تقویت ایراد ۲۶۵
اہلحدیث کس کو کہتے ہیں ۲۶۶
تتمہ ۲۶۸

رکعاتِ تراویح ۲۷۱

ساڑھے بارہ سو سال تک مسلمانوں کا کیا عمل رہا ۲۷۲
تنبیہ اوّل ۲۸۱
تنبیہ دوم ۲۸۲
اصل بحث ۲۸۵
قول و فعل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تراویح کا کوئی معین عدد ثابت ہے یا نہیں ۲۸۶
اہل حدیث کا پہلا دعویٰ ۲۸۸
ایک شبہہ کا ازالہ ۲۹۳

اہل حدیث کے پہلے دعویٰ کی دوسری دلیل ۲۹۶
حضرت جابر کی ایک دوسری روایت ۳۰۴
اہل حدیث کا دوسرا دعویٰ ۳۰۷
سائب کا بیس والا اثر ۳۱۰
جمہور امت کے دلائل ۳۲۶
بیس رکعت پر اجماع کی بحث ۳۵۵
ایک شبہہ کا دفعیہ ۳۶۲
ابن تیمیہ کی تحقیق میں آج بیس پڑھنا افضل ہے ۳۶۳
ابن تیمیہ اور نواب صاحب کی تحقیق میں بیس پر عمل کسی وقت بھی نہ مکروہ ہے نہ بدعت ۳۶۴
خاتمہ ۳۶۷
ضمیمہ رکعات تراویح ۳۶۸
ساڑھے بارہ سو سال تک مسلمانوں کا کیا عمل رہا ہے ۳۷۶

انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت ۳۸۵

عرض ناشر ۳۸۶
انتباہ ۳۹۳
باب اول ۳۹۵
ایک نہایت ضروری تنبیہ ۴۰۰
مصنف کے مزعومہ نظریہ کا ابطال مراتب خلافت راشدہ سے ۴۱۲
قوت وقلت استعداد کی بحث ۴۱۳
عصبیت کا مظاہرہ ۴۱۵
ایک عجیب نظریہ یا مصنف رسالہ کا تہافت ۴۱۶
نسبتاً کمتر و برتر کی تفریق کا ابطال نصوص سے ۴۲۱

ایک حنفی فقیہ کی شہادت ۴۲۵

باب دوم ۴۲۶

مسئلہ کفاءت ۴۲۶

غیر عربی برادریوں میں نسبی کفاءت کا بالکل اعتبار نہیں ۴۳۳

پیشہ کے لحاظ سے کفاءت کے اعتبار کی صحیح تشریح ۴۳۳

فقہ میں جولاہے اور دھنئے سے کون مراد ہے؟ ۴۳۳

عالم ہونے کی صورت میں پیشہ کی کفاءت کا قطعاً اعتبار نہیں ۴۳۶

نسبی کفاءت کی شرعی حیثیت یا اعتبار کفاءت کا مطلب ۴۳۷

ولی اور عورت کفاءت کا لحاظ نہ کریں تو کوئی باز پرس نہیں ۴۳۷

اعتبار کفاءت درجہ جواز میں ہے ۴۳۸

کفاءت صحت نکاح کے لئے معتبر ہے یا لزوم نکاح کے لئے ۴۳۹

بالغہ لڑکی اپنا نکاح غیر کفو میں کر لے تو نکاح صحیح ہے ۴۴۰

فتویٰ نویسی میں عصبیت کا ناخوشگوار مظاہرہ ۴۴۴

غیر کفو میں نکاح کی چند مثالیں ۴۴۵

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا نکاح فاروقی گھرانے میں ۴۴۷

ایک اور ستم ظریفی ۴۴۸

ایک شبہہ اور اس کا ازالہ ۴۵۲

غلط فہمی یا کسی اور سبب سے ادعائے شرافت کی چند مثالیں ۴۵۵

تبدیل نسب کی حرمت ۴۶۱

کسی قوم کی تنقیص ۴۶۷

عذر گناہ بدتر از گناہ ۴۸۴

مؤمنوں کو رذیل کہنے والوں کے لئے تازیانۂ عبرت ۴۸۶

سارے پیشے اباحت میں یکساں ہیں ۴۹۰

ہندوستانی شرفاء کے شجرہائے نسب ۴۹۳

الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلاقات المجموعۃ ۴۹۹
تمہید و تعارف ۵۰۰
باب اول ۵۰۴
آثار صحابہ ۵۱۷
وقوع ثلاث پر صحابہ کرام کا اجماع ۵۲۱
باب دوم ۵۲۴
باب سوم ۵۳۱
تنبیہ ۵۴۶
اضافہ ۵۵۰
آثار صحابہ ۵۵۰
اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ ۵۵۰
اثر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ۵۵۱
اثر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ۵۵۲
تنبیہ ۵۵۳
اثر حضرت عبداللہ بن معقل مزنی رضی اللہ عنہ ۵۵۳
سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ ۵۵۴
قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ ۵۵۴
امام مسروق رحمۃ اللہ علیہ ۵۵۵
سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ ۵۵۵
عکرمہ مولی ابن عباس رضی اللہ عنہما ۵۵۵
حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ ۵۵۶
امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ ۵۵۶
حکم بن عتیبہ رحمۃ اللہ علیہ ۵۵۶

حماد بن ابی سلیمان ؒ ۵۵۶

زہری ؒ وقتادہ ؒ کا فتویٰ ۵۵۶

تین طلاقوں کے بعد جو رجعت کا فتویٰ دے ۵۵۷

علامہ حافظ ابن حزم ؒ کا مذہب ۵۵۷

فتاویٰ الصحابة فی الطلقات المجموعة ۵۵۹

① حضرت عمر ؓ کا فتویٰ ۵۶۰

② فتویٰ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ ۵۶۱

③ فتویٰ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ ۵۶۳

مدخولہ اور غیر مدخولہ دونوں کا حکم ایک ہے ۵۶۴

فائدہ ثالثہ ایک عجیب تضاد ۵۷۰

اصل حقیقت ۵۷۱

خلاصہ بحث ۵۷۵

④ فتویٰ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ ۵۷۷

⑤ فتویٰ حضرت انس ؓ ۵۷۷

⑥ فتویٰ ابو ہریرہ ؓ ۵۷۸

⑦ فتویٰ حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ ۵۷۸

⑧ فتویٰ حضرت عثمان ؓ ۵۷۸

⑨ فتویٰ حضرت علی ؓ ۵۷۸

⑩ فتویٰ حضرت عمران بن حصین ؓ ۵۷۹

⑪ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ کا عمل ۵۷۹

⑫ فتویٰ حضرت مغیرہ بن شعبہ ؓ ۵۸۱

⑬ فتویٰ حضرت عائشہ ؓ ۵۸۱

⑭ فتویٰ حضرت اُمّ سلمہ ؓ ۵۸۱

⑮ فتویٰ حضرت ابوسعید خدری ؓ ۵۸۲

⑯ فتویٰ حضرت عبداللہ بن مغفل ؓ ۵۸۲

⑰ فتویٰ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ۵۸۲
تابعین رحمۃ اللہ علیہم ۵۸۲
① حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۴
② حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۵
③ عبداللہ بن معقل مزنی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۵
④ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۵
⑤ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۵
⑥ حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۶
⑦ مصعب بن سعد رحمۃ اللہ علیہ، ابو مالک رحمۃ اللہ علیہ، عبداللہ بن شداد رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۷
⑧ حضرت حکم رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۷
⑨ سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۷
⑩ حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۷
⑪ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۸
⑫ حمید بن عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۸
⑬ عبیدہ سلمانی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۹
⑭ مکحول رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۹
⑮ حضرت جابر بن زید رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۸۹
⑯ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۹۰
⑰ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۹۰
⑱ قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۹۱
⑲ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۹۱
⑳ حارث عکلی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۵۹۱
تاثر وتبصرہ ۵۹۲

پیشِ لفظ

امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن المحدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ ماضی قریب کے ان اہلِ علم میں سے تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے علم کو جلا نصیب فرمائی اور حدیث اور اصول حدیث کے امام مانے گئے۔ کتنی ہی علمی کتابیں آپ کے قلم سے مکمل ہوکر عوام وخواص کے لیے مفید ثابت ہوئیں اور ہدایت کا ذریعہ بنیں۔

حضرت امیر الہند الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، لیکن جمعیت علمائے ہند کے شروع سے ممبر رہے اور آخر تک اس سے وابستہ رہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی کتاب ''نصرۃ الحدیث'' دیکھی تو فرمایا:

> ''تحقیق کا حق ادا کردیا، شاید میں بھی اتنی تحقیق سے یہ کتاب نہیں لکھ سکتا تھا۔''

شیخ الاسلام حضرت مولانا السیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جمعیت علمائے ہند کو پیش آنے والے مسائل کے حل کے لیے کہہ رکھا تھا کہ جمعیت کے ارکان فقہی مسائل میں مولانا الاعظمی کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔

علمائے دیوبند کے یہ سرخیل اکابر جنہوں نے حضرت الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ پر بھرپور اعتماد کیا یہ ساری جماعت دیوبند کا حضرت الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ پر اعتماد کا مصداق ہے۔

انگریز کا کاشت کیا ہوا فتنہ ''غیر مقلدیت'' کی رد میں حضرت الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب سے خوب علمی کام سرانجام دیا۔ ان میں سے آپ کے چند شاہکار یہ ہیں:

① نصرۃ الحدیث۔

② تحقیق اہل حدیث۔

③ رکعات تراویح۔

④ انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت۔

⑤ الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلاقات المجموعۃ۔

ان رسائل کو رفیق العلماء مولانا محمد رفیق زمزمی زاد اللہ مجدہ اپنے ذوق نفاست کے اہتمام سے ”زم زم پبلشرز“ سے شائع کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ موصوف کی اس علمی خدمت کو قبولیت سے نواز کر نجات اور حضور اقدس ﷺ کی خوش نودی کا ذریعہ بنائے۔ اور علمائے کرام اور باذوق عوام کو اس سے استفادے کے مواقع نصیب فرمائے۔ آمین

مکتب تعلیم القرآن شریفیہ،
قاری شریف احمد اسٹریٹ،
قرآن منزل، پاکستان چوک کراچی،

تنویر احمد عفی عنہ
۱۶؍صفر المظفر ۱۴۲۸ھ
۶؍مارچ ۲۰۰۷ء

* * *

امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر تعارف

محدث وفقیہ ابو المآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار اس دور کے عظیم المرتبت اہلِ علم میں تھا، یوں تو آپ کو جملہ اسلامی علوم وفنون میں مہارت حاصل تھی، لیکن خاص طور سے علم حدیث کے اندر اس دور میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا، حقیقت یہ ہے کہ مولانا الاعظمی جیسے باکمال اہلِ علم اور آپ جیسے نابغہ اور عبقری صدیوں میں کہیں پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا الاعظمی ہندوستان کے مشہور صوبہ اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبہ مؤناتھ بھنجن میں ۱۳۱۹ھ میں پیدا ہوئے، تعلیم اپنے قصبہ کے علاوہ گورکھپور بنارس اور دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی، آپ کے اساتذہ میں مولانا عبدالغفار عراقی مئوی (تلمیذ رشید حضرت مولانا گنگوہی)، علامہ انور کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا کریم بخش سنبھلی جیسے اہلِ علم وفضل تھے۔ مولانا نے فراغت کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور بے پناہ تصنیفی، تالیفی اور تحقیقی مشغولیات کے باوجود تاحیات اس مشغلہ کو جاری رکھا۔ آپ کو اپنے وطن اور علاقہ کے عوام و خاص میں بڑی مقبولیت حاصل تھی، چنانچہ اتر پردیش کے مشرقی خطہ میں آپ ”بڑے مولانا“ کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے تھے، آپ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۰/ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۶/ مارچ ۱۹۹۲ء کو جب آپ کی وفات ہوئی ہے تو شدید گرمی اور دھوپ کے باوجود تقریباً دو لاکھ افراد آپ کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔

مولانا الاعظمی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامیہ کے تاحیات رکن رکین رہے، آپ آل

انڈیا مسلم پرسنلا لابورڈ کے رکن تاسیسی بھی تھے، ۱۹۵۲ء میں آزاد ہندوستان کا جب پہلا جنرل الیکشن ہوا تو آپ اپنے حلقہ سے اتر پردیش کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے، ۱۹۸۴ء میں آپ کی علمی و تحقیقی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو صدر جمہوریہ ایوارڈ پیش کیا گیا، ۱۹۸۶ء میں جب پہلی بار ہندوستان میں امارت شرعیہ ہند قائم ہوئی تو آپ اس کے سب سے پہلے امیر الہند منتخب ہوئے۔

مولانا کے علم وفضل کا چرا عرب وعجم ہر جگہ پھیلا اور اکثر اہلِ علم نے آپ کے علمی تفوق کا اعتراف کیا اور آپ کی علمی و تحقیقی خدمات کو سراہا۔ آپ کے علم وفضل کا اعتراف کرنے والوں میں آپ کے شیخ طریقت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالغفار عراقی مؤی، حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی، امام اہلسنّت مولانا عبدالشکور فاروقی، علامہ سیّد سلیمان ندوی، مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالوفا افغانی، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہم اور ڈاکٹر حمیداللہ حیدر آبادی جیسے اساطین علم وفن ہیں۔ اور عرب علماء میں جن لوگوں نے آپ کی تعریف وتوصیف کی ان میں علامہ زاہر کوثری، علامہ احمد محمد شاکر، علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، ڈاکٹر عبدالحلیم محمود سابق شیخ الازہر، شیخ حسن خالد سابق مفتی لبنان، شیخ عبدالرحمٰن یحییٰ معلّمی یمانی، شیخ علوی عباس مالکی، اور مولانا عبداللہ رمزی جیسے حضرات ہیں۔

حضرت مولانا الاعظمی نے تقریباً ۹۲ ربرس کی عمر پائی اور تقریباً پون صدی تک علم ودین کی نہایت عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ آپ اپنے وقت کے عظیم ترین محدث، فقیہ، اصولی، ادیب اور مصنف ومحقق تھے۔

آپ نے کئی کئی جلدوں پر مشتمل تقریباً ۲۵ کتابوں کی تحقیق وتعلیق لکھی، تقریباً ایک سوتیس مقالات اور لگ بھگ ۵۰ کتب ورسائل تصنیف فرمائے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ
سورۃ النساء آیت نمبر ۶۵

نصرۃ الحدیث

”جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا کہہ سکتا ہوں
کہ میں ایسا جامع اور محقق نہیں لکھ سکتا“
حکیم الامت حضرت تھانویؒ

تالیفات

محدثِ جلیل، امیر الہند
حضرت مولانا ابو المآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی
رحمہ اللہ تعالیٰ

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی

الحمدللّٰہ رب العلمین الصلوۃ والسلام علی سید
المرسلین وعلی آلہٖ وصحبہٖ اجمعین.

انگریزی دورِ حکومت میں اسلام اور تعلیمات اسلام کے خلاف بہت سارے فتنے سامنے آئے اوران کی شدت کا یہ حال تھا کہ مسلمانوں میں بھونچال کی صورت پیدا کر دی ان فتنوں میں ایک بڑا فتنہ منکرین حدیث کا تھا، جو بڑی قوت سے یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ ہماری رہنمائی کے لئے قرآن کافی ہے، حدیث نبوی کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ حدیث کا عظیم الشان ذخیرہ قابل اعتماد نہیں ہے پھر اس موضوع پر بہت ساری کتابیں لکھی گئیں اور مسلمانوں میں پھیلائی گئیں اور کوئی شبہہ نہیں کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ جو جدید علم سے گو آراستہ تھا مگر کتاب وسنت کی تعلیم سے قطعاً بے بہرہ تھا اس گمراہ فرقہ کے دھوکہ میں آنے لگا تھا۔

اس وقت ضرورت محسوس ہوئی کہ منکرین حدیث کے غلط پروپیگنڈے کی تردید کی جائے اور حجیت حدیث پر قلم اٹھایا جائے اور عام مسلمان خصوصاً اہل علم طبقہ کو اس گمراہی سے بچایا جائے اس نازک موقع پر والد محترم امیر الہند محدث کبیر حضرت مولانا ابو المآثر حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی شیخ الحدیث مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو نے ''نصرۃ الحدیث'' کے نام سے ایک محققانہ کتاب تصنیف فرمائی جو طبقہ علماء میں کافی مقبول ہوئی، اس وقت کے سب سے بڑے عالم دین حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے پڑھ کر تحریر فرمایا تھا کہ آپ نے عظیم خدمت انجام دی ہے، اور شاید ایسی تحقیقی کتاب کوئی دوسرا عالم نہیں لکھ سکتا تھا، خدمت حدیث کا آپ نے پورا حق ادا کر دیا ہے اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے۔

چنانچہ پہلی دفعہ یہ کتاب (نصرۃ الحدیث) ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور منکرین حدیث کے پھیلے ہوئے فتنہ پر آہنی دیوار ثابت ہوئی اور اس کا زور ٹوٹنے لگا اس وقت اس کے مسلسل دو ایڈیشن شائع ہوئے، حدیث کی حجیت اور اہمیت وفضیلت پر بہت مؤثر ثابت ہوئی اس کتاب کے مطالعہ سے بہت سارے مسلمانوں نے انکار حدیث نبوی سے توبہ کیا اور منکرین حدیث کی کتابوں سے جو تذبذب اور شکوک وشبہات ان کے دلوں میں پیدا ہو چکے تھے اس دلدل سے صحت وسلامتی کے ساتھ نکل آئے اور حدیث نبوی کی صحت اور اس کی ضرورت پر ایمان و یقین پختہ ہو گیا۔

ادھر عرصۂ دراز سے اس کا ایڈیشن ختم تھا بعض اہم علم کا تقاضا تھا کہ اسے پھر سے چھپوایا جائے تا کہ مسلمانوں کا نوجوان طبقہ اس کتاب کو پڑھے اور وہ کسی گمراہ کرنے والے کے دھوکہ وفریب میں نہ آنے پائے اس کتاب کی اہمیت وضرورت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کی کتابت شروع کر دی اب وہ طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے، خدا کرے جدید تعلیم یافتہ حضرات اور دوسرے عوام و خواص مسلمان اس کا مطالعہ کریں تا کہ آئندہ زندگی میں وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو سکیں۔ دعا ہے کہ رب العالمین ہماری اس علمی دینی اور اصلاحی خدمت کو قبول فرمائے، اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع عنایت فرمائے۔

رشید احمد الاعظمی

* * *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ طبع ثانی

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا

آج سے چھ برس پہلے میں نے مولانا بہاء الحق قاسمی (امرت سری) کی فرمائش پر منکرین حدیث کے رد میں نصرۃ الحدیث لکھی تھی، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے اس حقیر رسالہ کو بڑی مقبولیت بخشی، چنانچہ اس کا پہلا ایڈیشن جو مولانا بہاء الحق موصوف کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا، چند ہی دنوں میں ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔

اس وقت سے علم دوست حضرات کا اس کے دوسرے ایڈیشن کے لئے سخت تقاضا تھا۔ مولانا محمد ایوب صاحب ناظم مدرسہ مفتاح العلوم کو یہ تقاضے زیادہ سننے پڑتے تھے، اس لئے ان کو اس کی اشاعت کی زیادہ فکر تھی لیکن ان کا خیال تھا کہ اس پر ایک مقدمہ کا اضافہ ہو جائے جس میں محدثین کے حافظہ وغیرہ پر مبسوط تبصرہ ہو تو رسالہ کی افادی حیثیت کو چار چاند لگ جائیں۔ اس لئے وہ کئی سال سے مقدمہ لکھنے کا بہت اصرار سے تقاضا کر رہے تھے، اور اسی انتظار میں رسالہ کو پریس کے حوالہ نہیں کرتے تھے مجھ کو ان کی اس رائے سے بدیں لحاظ اتفاق تھا کہ اگر مقدمہ لکھنے کی نوبت آئی تو اس میں بہت سی وہ باتیں بھی پیش کر سکوں گا، جن کو اصل رسالہ میں لکھنے کی ضرورت تھی، مگر تطویل کے اندیشے سے وہاں قصداً نظر انداز کرنی پڑیں۔

بایں ہمہ دوسرے کاموں سے میں اتنی فرصت نہیں پاتا تھا کہ مقدمہ لکھ سکوں اب چونکہ فرصت کا انتظار کرتے کرتے کئی سال گزر گئے، اور رسالہ کی دوبارہ اشاعت میں بہت زیادہ تاخیر ہوگئی، اس لئے مجبوراً سردست دوسرے کاموں کو پیچھے ڈال کر مقدمہ لکھنا شروع کر رہا تھا۔ ’’واللّٰہ ولی التوفیق.‘‘

فتنہ انکار حدیث

ہندوستان میں انکار حدیث کی بدعت بظاہر تو عبداللہ چکڑالوی نے (پنجاب میں) ایجاد کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ چکڑالوی سے بہت پہلے اس فتنہ کا بیج نیچری فرقہ نے بویا تھا، عبداللہ چکڑالوی نے آکر اس شجرۂ ملعونہ کی آبیاری کی اور اسی کے ہاتھوں وہ بڑھا، اور پھولا پھلا اس لئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس فتنہ کا بانی وہی ہے۔

نیز نیچری فرقہ اپنے اس عقیدہ کا صاف لفظوں اور زیادہ گھناونے انداز میں اظہار نہیں کرتا تھا، چکڑاولی نے بے حجاب ہوکر اپنے کفریات کی اشاعت اور حد سے زیادہ ایمان سوز و اسلام کش پیرایۂ بیان اختیار کیا، اس لئے انکار حدیث کی لعنت اسی کی طرف منسوب کی گئی۔

انکار حدیث کا محرک وسبب

بہرحال اس فتنہ کا بانی جو بھی ہو، اس کا اصلی محرک تو جیسا کہ میں نصرة الحدیث میں بتا چکا ہوں لادینی و آزادہ روی ہے، مگر اپنی لادینی پر پردہ ڈالنے اور انکار حدیث کے عقیدہ میں زبردستی معقولیت پیدا کرنے کے لئے منکرین حدیث کہا اور لکھا کرتے ہیں کہ۔

> ”حدیثیں آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد دو سو برس بعد معرض تحریر میں آئی ہیں۔“[1]

چغتائی کا منشاء یہ ہے کہ ”جب دو سو برس تک حدیثیں لکھی نہیں گئیں، صرف یادداشت اور زبانی روایت پر دارومدار رہا، تو اس طویل مدت میں یادداشت کی کمزوری اور نقل در نقل کی وجہ سے حدیثوں کے الفاظ اور ان کے مضامین ومعانی کیا سے کیا ہو

---

[1] دیکھو عظیم بیگ چغتائی کا رسالہ تفویض

گئے ہوں گے، اس حالت میں حدیثوں پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔"

چغتائی صاحب کا یہ تخیل اپنی جگہ پر چاہے کتنا ہی غلط اور بے بنیاد ہوتا ہم غنیمت ہے کہ وہ سرے سے حدیثوں کا انکار نہیں کرتے، لیکن حق گو جو نصرۃ الحدیث میں ہمارے اصلی مخاطب ہیں، ان کی اپج تو یہ ہے کہ:

"یقینی بات ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے قبل تک لوگ حدیثوں کو نہ جانتے تھے، یعنی "حق گو" کے خیال فاسد میں آنحضرت ﷺ کا کوئی قول و فعل صحابہ نے کسی سے بیان ہی نہیں کیا، اور حدیثوں کا سرے سے کہیں وجود ہی نہ تھا، وہ تو عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں اور ان کے بعد لوگوں نے اپنی طرف سے حدیثیں بنا لیں۔"

"حق گو" کے اس تخیل فاسد کا رد تو میں نصرۃ الحدیث (صفحہ ۷۱ تا ۷۹) اور (۲۰۱ تا صفحہ ۲۰۸) میں نہایت وضاحت سے اتنے زور دار طریقہ پر کر چکا ہوں کہ کسی منصف مزاج کے لئے مجال گفتگو باقی نہیں رکھی ہے۔

رہا چغتائی صاحب کا تخیل تو گو اس کا غلط اور بے سر و پا ہونا بھی واضح ہے، اور نصرۃ الحدیث میں جگہ جگہ اس کا غلط ہونا بھی ثابت کیا جا چکا ہے، نیز جریدۂ ضیاء الاسلام (امرت سر) جلد اول نمبر ۱۴ میں اس مقالے کے سلسلے میں جو میرے ایک شاگرد کے نام سے شائع ہوا ہے، اس پر کافی بحث ہو چکی ہے، با این ہمہ اس پر کچھ شرح و بسط سے کلام کرنے کی اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے، کہ عربی سے ناواقف اور بالخصوص تاریخ حدیث سے نابلد طبقہ عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

چغتائی صاحب نے مذکورہ بالا تخیل میں گویا دو دعویٰ کئے ہیں۔

① آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد دو سو برس تک حدیثوں کا قید کتابت میں نہ آنا۔

② صرف یادداشت پر دار و مدار رہنے کی وجہ سے حدیثوں کا کچھ سے کچھ ہو جانا

.........اب آیئے ہم ان کے دونوں دعووں کو پرکھیں اور دیکھیں کہ ان میں کتنی

صداقت ہے۔

کتابت حدیث کی تاریخ

چغتائی صاحب کا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد دوسو برس تک حدیثیں صرف زبانی رہیں، لیکن جب ہم تاریخ وسیر کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ تاریخ سے بھی زیادہ مستند بیانات پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کی کتابت آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں شروع ہوچکی تھی۔

عہد نبوی میں حدیث کی کتابت

چنانچہ صحیح بخاری (جلد۱ صفحہ۲۲) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ صحابہ میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور کے پاس مجھ سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں نہیں ہیں، حضرت عبداللہ کے پاس اتنی زیادہ حدیثیں اس وجہ سے ہیں کہ وہ لکھا کرتے تھے، اور میں لکھتا نہ تھا، مسند احمد، اور طحاوی (جلد۲ صفحہ۳۸۴)، اور مجمع الزوائد (جلد۱ صفحہ۱۵۱) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اور دل سے یاد بھی کرتے تھے اور میں صرف دل سے یاد کرتا تھا، لکھتا نہ تھا۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے لکھنے کی اجازت لی تھی، اور آنحضرت ﷺ نے ان کو اجازت دے دی تھی، مجمع الزوائد (جلد۱ صفحہ۱۵۱) میں حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت سے مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ علم کو مقید کرو۔ حضرت عبداللہ نے پوچھا کہ علم کا مقید کرنا کیا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لکھنا، سنن ابوداؤد (جلد۲ صفحہ۷۷) اور دارمی (صفحہ۶۸) میں خود حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں جتنی باتیں[1] آنحضرت ﷺ کی زبان سے

---

[1] فقرہ کنت اکتب کل شی الخ ''یعنی میں ہر بات جو آنحضرت ﷺ سے سنتا تھا لکھ لیا کرتا تھا'' خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام حدیثیں لکھتے تھے، ۱۲ منہ

سنتا تھا یاد رکھنے کے لئے ان کو قلم بند کر لیتا تھا، قریش نے مجھ کو اس سے منع کیا کہ آنحضرت ﷺ بشر ہیں، اور بہت سی باتیں غصہ کی حالت میں بھی فرما جاتے ہوں گے اس لئے حدیثیں نہ لکھو، میں ان کے کہنے سے رک گیا، اور آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم لکھو اور اپنے دہان مبارک کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا کہ اس سے کسی حالت میں ناحق اور غلط بات نہیں نکلتی۔ ان بیانات کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں آپ کی تمام حدیثیں آپ کے حکم و اجازت سے لکھتے جاتے تھے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کتابت حدیث کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کو انہوں نے برابر جاری رکھا، تا آنکہ ان کے پاس احادیث کا ایک دفتر تیار ہو گیا تھا اور اس کا نام انہوں نے صادقہ رکھا تھا۔ اس دفتر احادیث سے ان کو ایسا عشق تھا کہ کسی حالت میں بھی اس کی مفارقت ان کو گوارا نہ تھی، فرماتے تھے ''ما یرغبنی فی الحیوٰة الا الصادقة'' یعنی مجھ کو زندگی کا خواہش مند یہی کتاب (صادقہ) بنا رہی ہے، یہ نہ ہو تو مجھے جینے کی خواہش نہیں ہے، پھر خود ہی صادقہ کا تعارف ان الفاظ میں کراتے تھے، ''اما الصادقة فصحیفة کتبتها من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم'' یعنی صادقہ ایک صحیفہ (دفتر) ہے جس کو میں نے آنحضرت ﷺ سے سن سن کر لکھا ہے۔[۱]

''یہ دفتر کتنا ضخیم ہوگا اور اس میں کتنی زیادہ حدیثیں ہوں گی، اس کا اندازہ لگانے کے لئے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان کافی ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے ایک ہزار (صرف) امثال یاد کئے ہیں۔''[۲]

تہذیب التہذیب (صفحہ ۵۴) میں ابن معین کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی چند کتابیں ان کے پوتے شعیب کو ملی تھیں، شعیب ان میں کی حدیثوں

---

[۱] دارمی: ص ٦٨ [۲] عینی: ١/١٨

کی روایت کیا کرتے تھے میں کہتا ہوں کہ حدیث کی کتابوں میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے جتنی حدیثیں مذکور ہیں وہ سب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اسی صحیفے کی حدیثیں ہیں، جیسا کہ تہذیب التہذیب (ترجمہ عمرو) میں متعدد محدثین نے اس کی تصریح کی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو کا یہ صحیفہ شعیب کے بعد ان کے بیٹے عمرو کے ہاتھ لگا تھا، اور وہ اس کو اپنے باپ کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔

عہد نبوی میں متعدد صحابہ کا حدیث لکھنا

یہ خیال بھی نہ کرنا چاہئے کہ عہد نبوی میں تنہا حضرت عبداللہ بن عمرو حدیثیں لکھتے تھے، اس لئے کہ سنن دارمی (صفحہ ۶۸) میں خود انہی کا بیان ہے کہ ایک دن ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے حدیثیں لکھ رہے تھے، اسی اثناء میں کسی نے پوچھا کہ قسطنطنیہ پہلے فتح ہوگا یا رومہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں ہرقل کا شہر پہلے فتح ہوگا، اس روایت میں "بینما نحن حول رسول اللّٰہ (صلی اللّٰہ علیہ وسلم نکتب)" کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ ان کے ساتھ ایک جماعت لکھ رہی تھی، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہی کے ایک دوسرے بیان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب انہوں نے حدیث لکھنا شروع نہیں کیا تھا اس وقت بھی کئی صحابی لکھا کرتے تھے، ان کا وہ بیان مجمع الزوائد (جلد۲ صفحہ ۵۲) میں یوں منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چند صحابی بیٹھے ہوئے تھے میں بھی ان کے ساتھ حاضر تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ارشاد فرمایا کہ جو آدمی مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔ جب ہم وہاں سے اٹھے تو میں نے ان صحابیوں سے کہا کہ یہ وعید سننے کے بعد آپ لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ تو ان صحابہ نے فرمایا کہ بھتیجے؟ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا ہے وہ سب ہمارے پاس لکھا ہوا ہے۔

اسی طرح دوسرے مستند بیانات سے بھی متعدد صحابہ کا حدیثیں لکھتے رہنا ثابت ہے۔ چنانچہ مجمع الزوائد (جلد ۱ صفحہ ۱۵۱) میں بحوالہ طبرانی حضرت رافع بن خدیج (صحابی) کا بیان مذکور ہے کہ ہم نے خدمت نبوی میں یہ گزارش کی کہ ”یا رسول اللہ انا نسمع منك اشياء فنكتبها قال اكتبوا ولا حرج“ یعنی یارسول اللہ ہم آپ کی زبان سے بہت سی چیزیں سنتے ہیں اور اس کو لکھ لیتے ہیں تو اس کی نسبت کیا حکم ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لکھتے رہو اس میں کوئی حرج نہیں ہے حضرت رافع کے اس بیان سے بھی معلوم ہوا کہ متعدد اشخاص کا دستور تھا کہ حدیثیں سن کر لکھ لیتے تھے۔ ترمذی (جلد ۲ صفحہ ۹۱) اور مجمع الزائد (جلد ۱ صفحہ ۲۵۱) میں حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ ایک انصاری صحابی نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی کہ مجھ کو حدیثیں یاد نہیں رہتیں تو آپ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے مدد لو یعنی لکھ لیا کرو۔

مجمع الزوائد (جلد ۱ صفحہ ۲۵۱) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حدیثوں کے یاد نہ رہنے کی شکایت کی، تو آپ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے مدد لو، کنز العمال (جلد ۵ صفحہ ۲۲۶) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ و حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہاتھ سے کام لینے (یعنی لکھنے) کا حکم دیا۔

عہد نبوی کی کتاب الصدقہ

ابوداؤد (جلد ۱ صفحہ ۱۵۶) اور ترمذی (جلد ۱ صفحہ ۷۹) میں حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے عاملوں کے پاس بھیجنے کے لئے ایک کتاب الصدقہ لکھوائی تھی جس میں جانوروں کی زکوٰۃ سے متعلق حدیثیں تھیں، لیکن ابھی اس کو عاملوں کے پاس بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی، کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کا سانحہ پیش آگیا، جب حضرت ابوبکر آپ ﷺ کے

جانشیں ہوئے تو انہوں نے اس پر عمل کیا۔

عہد نبوی کا ایک اور نوشتہ

ترمذی (جلد۱ صفحہ ۳۰۶)، اور نسائی (جلد۲ صفحہ ۱۹۱) میں عبداللہ بن حکیم کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں آپ کا ایک نوشتۂ مبارک ہمارے (قبیلہ جہینہ کے) پاس پہنچا، جس میں یہ حدیث بھی تھی کہ مردار جانور کی (بے پکائی ہوئی) کھال اور پٹھے کو کام میں نہ لاؤ۔

فتح مکہ کا خطبہ

صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن ایک طویل خطبہ دیا جس میں بہت سی حدیثیں ارشاد فرمائیں، جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت ابوشاہ یمنی نے درخواست کی کہ میرے لئے یہ خطبہ لکھوا دیا جائے، حضرت نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی اور حکم دیا کہ ان کو خطبہ لکھ کر دے دیا جائے۔

کتاب عمرو بن حزم

طحاوی (جلد۲ صفحہ ۴۱۷)، اور نسائی وغیرہما میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک نوشتہ لکھوا کر عمرو بن حزم کے ہاتھ اہل یمن کے پاس بھیجا تھا اس نوشتہ میں فرائض وسنن اور خون بہا کے مسائل تھے، اس نوشتہ کے جستہ جستہ فقرے حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں، مستدرک حاکم (جلد۱ صفحہ ۳۹۵) لغایت (صفحہ ۳۹۷) میں اس نوشتہ سے تریسٹھ حدیثیں نقل کی ہیں۔ اہل یمن کے نام ایک نوشتہ نبوی کا ذکر امام شعبی نے بھی کیا ہے، اور اس نوشتہ کی کئی حدیثیں امام شعبی کی روایت سے مصنف ابن ابی شیبہ (صفحہ ۱۰ از کوٰۃ وصفحہ ۱۲ از کوٰۃ) میں منقول ہیں۔

صحیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

عہد نبوی کے نوشتوں میں سے ایک حضرت علی کا صحیفہ بھی تھا جس میں خود حضرت علی کے بیان کے مطابق خون بہا اور اسیروں کی رہائی کے مسائل تھے اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ کوئی مسلمان کافر (حربی) کے بدلہ میں نہ مارا جائے[1] اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ مدینہ کی سرزمین عیر سے ثور تک حرم (بہت زیادہ قابل احترام) ہے لہٰذا جو شخص اس میں کوئی بدعت نکالے، یا کسی بدعتی کو پناہ دے اس پر تمام انسانوں اور فرشتوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ اس کی کوئی فرض یا نفل عبادت قبول نہ کرے گا[2] اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ جو شخص غیر خدا کی تعظیم و خوشنودی کے لئے جانور ذبح کرے اس پر اللہ کی لعنت اور اس پر بھی اللہ کی لعنت جو اپنے باپ پر لعنت کرے اور اس پر بھی اللہ کی لعنت جو کسی بدعتی کو پناہ دے اور اس پر اللہ کی لعنت جو زمین کا نشان مٹائے۔[3]

اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ سب مسلمانوں کا خون برابر ہے، اور یہ کہ ایک معمولی مسلمان نے ذمہ لے لیا تو اس کا پاس و لحاظ سب مسلمانوں پر ضروری ہے اگر کوئی شخص کسی مسلمان کا ذمہ توڑے گا تو اس پر خدا اور سارے فرشتوں اور انسانوں کی لعنت، اور یہ بھی تھا کہ جو شخص اپنے مولی کے سوا دوسرے کو مولی بنائے اس پر بھی سب کی لعنت۔[4]

اور اس میں زکوٰۃ کے مسائل بھی تھے۔[5]

عہد نبوی میں کتابت حدیث کے یہ چند واقعات سرسری طور پر میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیئے ہیں، تلاش و جستجو کرنے والے کو اور واقعات بھی مل سکتے ہیں۔

---

[1] بخاری: ۲۱/۱ [2] بخاری: ۲۵۱/۱ و مسلم [3] مسلم: ۱۶۱/۲

[4] بخاری: ۲۵۱/۱ [5] بخاری ۴۳۸/۱ نیز مسند احمد و طحاوی: ۳۰۴/۲

عہد صحابہ میں حدیث کی کتابت

اس کے بعد عہد صحابہ کی تاریخ پڑھئے اس عہد میں بھی آپ کو کتابت حدیث کے بے شمار واقعات ملیں گے، تمثیل کے طور پر چند واقعات اس عہد کے بھی نقل کئے جاتے ہیں۔

❶ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت صدیق اکبر کا واقعہ سنئے مورخ اسلام حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (صفحہ۵) میں اور شیخ علی متقی نے کنزالاعمال (جلد۵ صفحہ۲۳۷) میں امام حاکم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق نے آنحضرت ﷺ کی حدیثیں جمع کرنا شروع کی تھیں، پانچ سو حدیثیں لکھ چکے تھے کہ ایک دن اس مجموعہ کو منگا کر آگ میں ڈال دیا اور فرمایا کہ اس میں میں نے وہ حدیثیں بھی لکھی تھیں، جن کو براہ راست آنحضرت ﷺ سے میں نے نہیں سنا تھا۔ بلکہ کسی اور کی زبانی سنا تھا، ممکن ہے کہ اس نے مجھ سے جس طرح بیان کیا ہے، اس طرح آنحضرت ﷺ نے نہ فرمایا ہو۔ کسی اور طرح فرمایا ہو تو خواہ مخواہ میری گردن پر اس کا بوجھ ہوگا۔

❷ دارمی (صفحہ۶۸) ومستدرک حاکم (جلد۱ صفحہ۱۰۶) میں امیر المؤمنین فاروق اعظم کا یہ فرمان منقول ہے کہ علم کو کتاب میں مقید کرلو۔

❸ دارمی ومستدرک میں حضرت انس ؓ سے بھی مروی ہے کہ علم کو لکھ کر مقید کرو۔ نیز صحیح مسلم (جلد۱ صفحہ۴۶) میں ہے کہ حضرت انس ؓ نے محمود بن الربیع ؓ (صحابی) کی زبانی حضرت عتبان ؓ کی ایک طویل حدیث سنی تو اپنے لڑکے سے کہا کہ اس کو لکھ لو۔ چنانچہ انہوں نے لکھ لیا۔ طحاوی (جلد۲ صفحہ۳۸۴) میں بھی حضرت انس ؓ کا اپنے لڑکے سے حدیث لکھوانا مذکور ہے۔

❹ حضرت ابوہریرہ ؓ (المتوفی ۵۸ھ) کی نسبت اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ

عہد نبوی میں حدیثوں کو لکھا نہ کرتے تھے، لیکن بعد میں انہوں نے بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر یا کسی دوسرے سے لکھوا کر اپنی حدیثوں کو سفینہ میں محفوظ کر لیا تھا، چنانچہ فتح الباری (جلد ۱ صفحہ ۱۴۸) میں حسن ابن عمرو کا بیان ہے کہ حضرت ابو ہریرہ ؓ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے، اور حدیث نبوی کی کئی کتابیں دکھا کر فرمایا کہ دیکھو یہ میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہیں۔

اور بشیر بن نہیک کا بیان طحاوی (جلد ۲ صفحہ ۳۸۵) میں ہے کہ میں حضرت ابو ہریرہ ؓ سے حدیث کی کتابیں عاریت لے کر نقل کرتا تھا، نقل سے فارغ ہو کر ان کو کل سناتا جاتا تھا، سنانے کے بعد عرض کرتا تھا کہ میں نے آپ کو جو سنایا ہے وہ سب آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ ہاں۔

۵ حضرت ابن عباس (المتوفی ۶۸ھ) کے بھی چند صحیفے تھے، جن میں حدیثیں قلم بند تھیں، چنانچہ ترمذی (جلد ۲ صفحہ ۲۳۸) اور طحاوی (جلد ۲ صفحہ ۳۸۴) میں ہے کہ طائف کے کچھ لوگ حضرت ابن عباس ؓ کے پاس ان کے چند صحیفے لے کر حاضر ہوئے کہ آپ ہم کو یہ سنا دیں، اس وقت حضرت ابن عباس ؓ کی نگاہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ پڑھ نہ سکے اور فرمایا تم خود سنا دو، تمہارا سنانا اور میرا پڑھنا جواز روایت کے حق میں دونوں برابر ہیں۔

۶ ابوداؤ (جلد ۲ صفحہ ۱۸) میں ابوالبختری کا بیان ہے کہ میں نے ایک صحابی یا تابعی سے حدیث سنی، اور مجھ کو بہت بھلی معلوم ہوئی، تو میں نے ان سے درخواست کی کہ اس کو میرے لئے لکھ دیجئے، چنانچہ انہوں نے لکھ کر میرے حوالہ کیا۔

۷ دارمی (صفحہ ۶۸) میں ہے کہ ابان (تابعی) حضرت انس ؓ کے پاس بیٹھے ہوئے ساگون کی تختیوں پر حدیثیں لکھتے رہتے تھے۔

۸ طحاوی (جلد ۲ صفحہ ۳۸۴) میں عبداللہ بن محمد بن عقیل کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت جابر ؓ (المتوفی ۷۸ھ) کی خدمت میں حاضر ہو کر آنحضرت ﷺ کی

حدیثوں کو پوچھتے تھے، اور لکھ لیتے تھے۔

⑨ دارمی (صفحہ ۶۹) میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ (المتوفی ۷۴ھ) نے فرمایا کہ علم کو قید تحریر میں لاؤ چنانچہ دارمی ہی میں حضرت سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے حدیثیں سنتا تھا تو لکھ لیتا تھا۔

⑩ دارمی (صفحہ ۶۹) اور طحاوی (جلد ۲ صفحہ ۳۸۴) میں ہے کہ حضرت سعید بن جبیر وغیرہ حضرت ابن عباس کے پاس حدیثیں لکھتے رہتے تھے، بلکہ دارمی میں یہ بھی ہے کہ کاغذ بھر جاتا تھا تو کسی دوسری ہی چیز پر لکھ لیتے تھے۔

⑪ دارمی (صفحہ ۶۹) میں ہے کہ عنترہ کو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حدیث لکھنے کی اجازت دی۔

⑫ دارمی (صفحہ ۶۹) میں عبداللہ بن حنش کا بیان ہے، کہ میں نے حضرت براء رضی اللہ عنہ (المتوفی ۷۲ھ) کی مجلس میں لوگوں کو ہتھیلیوں پر بھی حدیث لکھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ناچیز کہتا ہے کہ کاغذ بھر جاتا ہوگا، تو ہتھیلیوں پر اس لئے لکھ لیتے ہوں گے کہ گھر پہنچ کر کاغذ پر نقل کر لیں گے۔

⑬ دارمی میں ہے کہ حسن بن جابر نے حضرت ابوامامہ (المتوفی ۷۶ھ) باہلی سے حدیث لکھنے کی بابت دریافت کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

⑭ مجمع الزوائد (جلد ۱ صفحہ ۱۵۱) میں ابو بردہ اشعری کا بیان مذکور ہے۔ کہ میں اپنے والد (حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) سے حدیثیں سنتا تھا تو لکھ لیا کرتا تھا ایک دن میرے والد نے میرا مجموعہ منگوا کر مجھ سے پڑھوایا میں پڑھ چکا تو فرمایا کہ ہاں میں نے آنحضرت ﷺ سے اسی طرح سنا ہے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کچھ کمی بیشی نہ ہو جائے۔

عہد تابعین میں کتابت حدیث

اوپر جو واقعات آپ نے پڑھے، ہیں، ان میں صحابہ کے سامنے یا صحابہ سے سن

کر حدیث لکھنے کا ذکر ہے، اب چند ایسے واقعات سنئے جن میں تابعین کے سامنے یا تابعین سے سن کر حدیث لکھنے کا تذکرہ ہے۔

① ترمذی (جلد۲ صفحہ۲۳۸) اور دارمی (صفحہ۶۶) میں ابراہیم نخعی کا بیان ہے کہ سالم ابن ابی الجعد حدیثیں لکھا کرتے تھے، سالم کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی ہے اور انہوں نے بعض صحابہ سے بھی حدیثیں سنی ہیں۔

② تذکرۃ الحفاظ (جلد۱ صفحہ۱۰۳) میں ابوالزناد (تابعی) کا بیان ہے کہ ہم زہری کے ساتھ علماء کے پاس حدیثیں سننے کے لئے جاتے تھے، زہری اپنے ساتھ تختیاں اور کاغذ لئے رہتے تھے، اور جتنا سنتے سب لکھتے رہتے تھے، زہری کی وفات ۱۲۴ھ میں ہوئی ہے۔

③ کنزالعمال (جلد۵ صفحہ۲۳۸) میں صالح بن کیسان (تابعی) کا بیان ہے کہ طلب علم کے زمانہ میں میرا اور زہری کا ساتھ تھا، زہری نے مجھ سے کہا آؤ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں لکھیں، چنانچہ ہم دونوں نے حدیثیں لکھیں۔

④ دارمی (صفحہ۶۹) میں ہشام ابن الغاز کا بیان منقول ہے کہ عطاء بن ابی رباح تابعی سے لوگ پوچھتے جاتے تھے اور انہی کے سامنے لکھتے جاتے تھے، عطاء ابن ابی رباح کی وفات ۱۱۴ھ میں ہوئی۔

⑤ دارمی میں (صفحہ۶۹) میں رجاء بن حیوۃ (المتوفی ۱۱۲ھ) کا بیان ہے کہ ہشام ابن عبدالملک نے اپنے عامل کو مجھ سے ایک حدیث دریافت کرنے کے لئے لکھا، اگر وہ حدیث میرے پاس لکھی ہوئی نہ ہوتی تو میں اس کو بھول ہی چکا تھا۔

⑥ دارمی (صفحہ۶۹) میں سلیمان بن موسیٰ کا بیان ہے کہ میں نے نافع (تابعی) کو دیکھا ہے کہ وہ حدیثیں اپنی زبان سے بولتے جاتے ہیں اور لوگ ان کے سامنے لکھتے جاتے ہیں، نافع کا انتقال ۱۱۷ھ میں ہوا۔

⑦ ترمذی (جلد۲ صفحہ۲۳۹) میں ہے کہ ایک شخص حسن بصری کے پاس آیا اور کہا

کہ میرے پاس آپ کی بیان کردہ کچھ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں میں ان کی روایت آپ سے کرسکتا ہوں؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں، تہذیب التہذیب میں ہے کہ حمید طویل نے حسن بصری کی کتابیں نقل کی تھیں۔[1] حسن بصری کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی۔

⑧ ترمذی (جلد۲ صفحہ۲۳۹) میں ابن جریج کا بیان ہے کہ میں ہشام بن عروہ کے پاس ایک کتاب لے کر پہنچا اور کہا یہ آپ کی روایتیں ہیں ان کو میں بیان کروں؟ تو انہوں نے کہا، ہاں ہشام بن عروہ کی وفات ۱۴۶ھ میں ہوئی۔

⑨ تذکرۃ الحفاظ (جلد۱ صفحہ۸۸) میں ہے کہ ابوقلابہ وفات کے وقت اپنی کتابوں کی وصیت ایوب سختیانی کے لئے کر گئے تھے چنانچہ وہ کتابیں شام سے اونٹ پر بار کر کے لائی گئیں، ایوب فرماتے ہیں کہ میں نے بارہ چودہ درم ان کا کرایہ ادا کیا ابوقلابہ کی وفات ۱۰۴ھ میں ہوئی۔

⑩ صحیح بخاری جلد۱ فتح الباری (جلد۱ صفحہ۱۴۰) اسعاف المبطا (صفحہ۵) دارمی (صفحہ۶۸) میں ہے کہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام اطراف سلطنت میں یہ فرمان بھیجا کہ آنحضرت ﷺ کی حدیثوں کو جمع کرو چنانچہ ابوبکر بن حزم (جو ان کی طرف سے مدینہ کے امیر و قاضی تھے) کے پاس جب یہ فرمان پہنچا تو انہوں نے حدیث کے کئی مجموعے تیار کئے، مگر ابھی ان کو دربار خلافت میں بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ عمر بن عبدالعزیز کی وفات ہوگئی، نیز عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے ابن شہاب زہری نے بھی حدیثوں کو مدون کیا تھا، تذکرۃ الحفاظ (جلد۱ صفحہ۱۰۶) میں معمر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زہری کی حدیثوں کے دفتر کئی اونٹوں پر بار کئے گئے تھے، عمر بن عبدالعزیز کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی ہے۔

عہد تابعین کے یہ چند واقعات بر سبیل تذکرہ میں نے پیش کئے ہیں، اور ہر واقعہ کے ساتھ صاحب واقعہ کا سن وفات بھی لکھ دیا ہے سنین وفات دیکھ کر آپ معلوم

---

[1] تہذیب التہذیب: ۳۹/۳

کر سکتے ہیں کہ یہ واقعات وفات نبوی سے صرف سو برس بعد کے ہیں بلکہ اکثر تو سو برس کے اندر ہی کے ہیں۔

تبع تابعین کے عہد میں حدیث کی کتابت

اب ذرا اور قریب آیئے اور تبع تابعین کا دور نظر کے سامنے رکھئے تو اور زیادہ کتابت احادیث کے واقعات آپ کی نگاہ سے گزریں گے، اور حدیثوں کے دفتر کے دفتر آپ کو دکھائی دیں گے جو اس عہد میں لکھے گئے، اور ان میں سے بعض بعض آج بھی ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ اس دور میں حدیثوں کے لکھنے کا یہ دستور تو باقی ہی تھا، کہ استاذ سے جو حدیثیں سنیں، لکھ لیں، چنانچہ محمد بن بشیر کا بیان ہے کہ مسعر (المتوفی ۱۵۵ھ) کے پاس ایک ہزار حدیثیں تھیں، میں نے دس کے سوا ساری لکھ لیں۔[1]

عبدالرزاق کا بیان ہے کہ میں نے معمر المتوفی ۱۵۳ھ سے دس ہزار حدیثیں سن کر لکھی ہیں۔[2]

حماد بن سلمہ کے پاس قیس بن سعد کی کتاب تھی۔[3] ثوری یمن گئے تو ان کو ایک تیز لکھنے والے کاتب کی ضرورت ہوئی، ہشام ابن یوسف کا بیان ہے کہ لوگوں نے مجھ کو پیش کیا، چنانچہ میں ان کے لئے حدیثیں لکھا کرتا تھا۔[4]

ابونعیم کا بیان ہے کہ میں نے آٹھ سو مشائخ سے حدیثیں لکھی ہیں، شعیب بن حمزہ نے بہت زیادہ حدیثیں لکھی تھیں، زہری بولتے اور شعیب لکھتے تھے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے شعیب کی کتابیں دیکھی تھیں ان کا بیان ہے کہ شعیب کی کتابیں بہت صحیح اور درست تھیں، شعیب کی وفات ۱۶۳ھ میں ہوئی۔[5]

ابوعوانہ پڑھنا جانتے تھے، لکھنا نہیں جانتے تھے، اس لئے جب حدیث سننے

---

[1] تذکرہ: ص ۱۷۷

[2] تذکرہ: ۱/۱۷۵

[3] تذکرہ: ۱/۱۹۸

[4] تذکرہ: ۱/۳۱۶

[5] تذکرہ: ۱/۲۱۰

کے لئے جاتے تو دوسرے سے لکھواتے تھے ابو عوانہ کی وفات ۱۶۳ھ میں ہوئی۔[1]

ابن لہیعہ کے پاس بھی حدیث کی کتابیں تھیں، چنانچہ ابن صالح کا بیان ہے کہ میں نے عمارہ بن غزیہ کی حدیثیں ابن لہیعہ ہی کی اصل سے نقل کی ہیں، ابن لہیعہ نے ۱۷۴ھ میں انتقال کیا۔[2]

سلیمان ابن بلال المتوفی ۱۷۲ھ کے مسموعات کی بھی کئی کتابیں تھیں اور اپنے مرنے کے وقت وصیت کر گئے تھے کہ وہ کتابیں عبدالعزیز بن حازم کو دی جائیں۔[3]

ابو حاتم رازی کا بیان ہے کہ ابو نعیم نے عبدالسلام بن حرب سے کئی ہزار حدیثیں سن کر لکھیں، عبدالسلام کی وفات ۱۸۷ھ میں ہوئی۔[4]

ابن المبارک نے اپنی لکھی ہوئی جن حدیثوں کی روایت کی، اور لوگوں کو سنایا ان کی تعداد بیس ہزار تھی۔[5]

غندر کے پاس بھی ان کی مسموعات کی کتابیں تھیں، ابن معین کا بیان ہے کہ ان کی کتابیں سب سے زیادہ صحیح تھیں۔

ابن مہدی کا بیان ہے کہ ہم شعبہ کی زندگی ہی میں غندر کی کتابوں سے فائدہ اٹھاتے تھے، غندر کی وفات ۱۹۳ھ میں ہوئی۔[6]

بہر حال کتابت حدیث کے اسی دستور کے علاوہ باقاعدہ تصنیف کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا، چنانچہ مکہ معظمہ میں ابن جریج المتوفی ۱۵۰ھ نے، یمن میں معمر بن راشد المتوفی ۱۵۳ھ نے، بصرہ میں سعید بن ابی عروبہ المتوفی ۱۵۲ھ اور ربیع بن صبیح المتوفی ۱۶۱ھ نے حدیث کی کتابیں تصنیف کیں، اور اسی عہد میں موسیٰ بن عقبہ المتوفی ۱۴۱ھ اور ابن اسحاق المتوفی ۱۵۱ھ نے غزوات وسیرت نبوی پر کتابیں لکھیں۔

اور ان کے بعد امام اوزاعی المتوفی ۱۵۷ھ نے شام میں امام ابن المبارک

---

[1] تذکرہ: ۱/۲۱۹

[2] تذکرہ: ۱/۲۲۰

[3] تذکرہ: ۱/۲۴۷

[4] تذکرہ: ۱/۲۴۹

[5] تذکرہ: ۱/۲۵۴

[6] تذکرہ: ۱/۱۷۷

المتوفی ۱۸۱ھ نے خراسان میں حماد بن سلمہ المتوفی ۱۶۷ھ نے بصرہ میں سفیان ثوری المتوفی ۱۶۱ھ نے کوفہ میں جریر بن عبدالحمید المتوفی ۱۸۸ھ نے رے میں، اور ہشیم المتوفی ۱۸۳ھ نے واسط میں حدیث کی کتابیں لکھیں۔

اور تقریباً اسی زمانہ میں امام مالک نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب موطا تصنیف فرمائی، امام مالک نے ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔

اسی زمانہ میں ابو معشر سندی نے غزوات نبوی پر کتاب لکھی ابو معشر نے ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔

ان حضرات کے بعد ابراہیم بن محمد اسلمی استاذ شافعی نے امام مالک کی موطا کے طرز پر اپنی موطا لکھی جس کی نسبت ابن عدی کا بیان ہے کہ موطائے مالک سے وہ چند گونہ بڑی تھی، ابراہیم کی وفات ۱۸۴ھ میں ہوئی۔[1]

یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کوفی شاگرد امام اعظم بھی صاحب تصنیف تھے، یحییٰ کا انتقال ۱۸۲ھ میں ہوا۔[2]

معانی بن عمران موصلی المتوفی ۱۸۵ھ نے کتاب السنن، کتاب الزهد، کتاب الادب، کتاب الفتن وغیرہ تصنیف کی۔[3]

عبدالرحیم بن سلیمان کنانی نے بھی کئی کتابیں لکھیں۔[4]

امام ابو یوسف المتوفی ۱۸۲ھ نے کتاب الآثار، کتاب الخراج وغیرہ لکھیں، اور امام محمد المتوفی ۱۸۹ھ نے موطا کتاب الآثار، کتاب الحج وغیرہ تصنیف فرمائیں، ولید بن مسلم المتوفی ۱۹۵ھ نے حدیث کے مختلف ابواب و موضوعات پر ستر کتابیں لکھیں۔[5]

امام وکیع بھی فن حدیث میں صاحب تصنیفات تھے ۱۹۷ھ میں ان کی وفات

---

[1] تذکرہ

[2] تذکرہ: ١/٢٤٦

[3] تذکرہ: ١/٢٦٥

[4] تہذیب: ٦/٣٠٦

[5] تذکرہ: ١/٢٧٩

ہوئی۔[1]

ابن وہب المتوفی ۱۹۷ھ نے اہوال القیامۃ اور جامع وغیرہ تصنیف کیں، نیز ایک بہت ضخیم موطا بھی ان کی تصنیفات میں ہے۔

محمد بن فضیل المتوفی ۱۹۵ھ نے کتاب الزہد، کتاب الدعاء، وغیرہ اپنی یادگار چھوڑی۔ اس دور کی تصنیفات میں سے سفیان کی جامع، ابن المبارک کی کتاب الزہد والرقاق، امام مالک کی موطا، ابو یوسف کی کتاب الآثار، اور کتاب الخراج اور امام محمد کی موطا، کتاب الآثار اور کتاب الحج وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔

چغتائی کا دوسرا دعویٰ

چغتائی کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ دو سو برس تک صرف زبانی روایت پر دارومدار رہنے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہوگئیں، اگرچہ پہلے دعویٰ کا غلط اور بے سروپا ہونا ثابت کر دینے کے بعد اس دوسرے دعویٰ پر کچھ لکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ یہ دعویٰ تمام تر پہلے ہی دعویٰ پر مبنی ہے اور اس کا غلط ہونا ثابت ہو چکا، تو اب اس کے غلط ہونے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ تاہم تبرعاً اس پر کلام کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اگرچہ اوپر تاریخی شواہد سے ثابت ہو چکا ہے کہ صرف زبانی روایت پر کسی زمانے میں بھی دارومدار نہیں رہا ہے بلکہ عہد نبوی ہی سے کتابت حدیث کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے لیکن اگر بالفرض یہ سلسلہ نہ رہا ہوتا تو بھی عہد نبوی سے لے کر پچھلے ہر دور میں حدیثوں کو سینے میں محفوظ رہنے کا جو بلیغ اہتمام تھا اور اس کے اداء و بیان کرنے میں جو کامل احتیاط مدنظر تھا، اس کے پیش نظر یہ دعویٰ کرنا ممکن ہی نہیں کہ زبانی روایت پر دارومدار رہنے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہوگئیں۔

---

[1] تذکرہ: ۱/۲۸۳

حفظ حدیث کا اہتمام بلیغ

عہد نبوی ﷺ

عہد نبوی میں حدیثوں کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ اہتمام تھا کہ صحابہ حدیثوں کا دور کیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے حدیثیں سنتے رہتے تھے، جب آپ مجلس سے اٹھ جاتے تو ہم آپس میں حدیثوں کا دور کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک آدمی کل حدیثیں بیان کر جاتا پھر دوسرا، پھر تیسرا، بسا اوقات ساٹھ ساٹھ آدمی مجلس میں ہوتے تھے اور وہ ساٹھوں باری باری سے بیان کرتے تھے، اس کے بعد جب ہم اٹھتے تھے تو حدیثیں اس طرح ذہن نشین ہوتی تھیں کہ گویا ہمارے دلوں میں بودی گئی ہیں۔[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں فرض نمازں کے بعد مسجد میں صحابۂ کرام بیٹھ جاتے، اور قرآن پاک اور احادیث نبویہ کا مذاکرہ کرتے تھے۔[2]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ صحابۂ کرام جب کہیں بیٹھتے تھے تو ان کی گفتگو کا موضوع فقہ یعنی آنحضرت ﷺ کی حدیثیں ہوتی تھیں یا پھر یہ کہ کوئی آدمی قرآن پاک کی کوئی سورۃ پڑھے یا کسی سے پڑھنے کو کہے۔[3]

دور کرنے کے علاوہ انفرادی طور پر بھی حدیثوں کو ازبر کرنے کا بڑا اہتمام تھا، اور جن کو باجود کوشش کرنے کے حدیثیں یاد نہ ہوتی تھیں وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اس کی شکایت کرتے تھے اور پوچھتے تھے کہ حدیثوں کو محفوظ رکھنے کی کیا تدبیر کریں جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بیان

---

[1] مجمع الزوائد: ۱/۱۶۱ [2] مستدرک: ۱/۹۴ [3] مستدرک: ص ۹۴

سے اوپر (زیر عنوان عہد نبوی میں حدیث کی کتابت) معلوم ہو چکا ہے، نیز حضرت ابو ہریرہ ؓ کا یہ بیان بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ میں حدیثوں کو صرف دل سے یاد کرتا تھا اور حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ از بر کرنے کے ساتھ ساتھ لکھتے بھی تھے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا بیان مسلم (جلد ۱ صفحہ ۱۰)، ابن ماجہ (صفحہ ۴) وغیرہ میں ہے۔ ”کنا نحفظ الحدیث“ یعنی ہم حدیثیں یاد کیا کرتے تھے، اس قسم کے مزید واقعات نقل کر کے بات کو طول دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، صرف ایک بات لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کا صحابہ کو نہایت تاکیدی حکم تھا کہ جو لوگ میری مجلس میں حاضر ہوں وہ غیر حاضروں کو میری حدیثیں ضرور پہنچا دیں[1]۔ نیز ان لوگوں کے حق میں تروتازگی و سرسبزی کی دعا فرمائی تھی، جو آپ کی حدیثوں کو سن کر خوب اچھی طرح یاد کر لیں اور پھر اس کو بجنسہ دوسروں کو تک پہنچا دیں۔

> ”نضر اللّٰه عبدا سمع مقالتی (وفی روایة) حدیثنا (کما فی الدرای صفحه٤٢) فحفظها ووعاهاواداها (وفی روایة) فبلغه (دارمی صفحه٤٢) کما سمع.“[2]
>
> **ترجمہ:** ”اللہ تعالیٰ اس بندہ کو سرسبز (خوش) رکھے جو میری کوئی حدیث سن کر یاد کر لے اور خوب سمجھ لے پھر اس کو جس طرح سنا ہے اسی طرح دوسرے کو پہنچا دے۔“[3]

---

[1] بعض دوسری روایتوں میں حدیثوں کی روایت کرنے والوں کو اپنا جانشین فرمایا ہے۔ (کنز العمال: ۲۲۲/۵)، ایک دوسری حدیث میں اس شخص کو جنت کی بشارت دی ہے، جو امت کے لئے چالیس حدیثیں محفوظ کر لے۔ (بخاری: ۱۶/۱)

[2] مشکوٰۃ ص ۲۷ بحوالہ احمد ترمذی ابوداؤد ابن ماجہ، دارمی

[3] اس مضمون کو تقریباً انہی الفاظ میں آنحضرت ﷺ سے ابن مسعود و عائشہ، زید بن ثابت، جبیر بن مطعم، انس، ابو ہریرہ، عمیر بن قتادہ، سعد بن ابی وقاص، ابن عمر، معاذ بن جبل، نعمان بن بشیر عن ابیہ اور زید بن خالد ؓ نے روایت کیا ہے۔ (کنز العمال: ۲۲۰/۵، ۲۲۱، ۲۲۲)

صحابہ کے حالات سے جو لوگ باخبر ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے اس حکم کی تعمیل اور اس دعا میں اپنے کو شامل کرنے کے لئے انہوں نے ہرگز کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ہوگا۔

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم

عہد صحابہ میں بھی حدیثوں کو ازبر کرنے کا بیش از بیش اہتمام تھا، حضرات صحابہ اپنے شاگردوں کو یاد کرنے کی برابر تاکید کرتے رہتے تھے، اور محفوظ رکھنے کی تدبیر بھی بتایا کرتے تھے۔

❶ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے۔

"تذاکر واھذا الحدیث لا ینفلت منکم."[1]

ترجمہ: "حدیثوں کا آپس میں مذاکرہ (دور) کیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔"

❷ یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔

"ردوا الحدیث واستذکروہ فانہ ان لم تذکروہ ذھب."[2]

ترجمہ: "حدیث کو (بار بار پڑھ کر) دہرایا کرو اور اس کو مستحضر کرو اگر اس طرح یاد نہ کرو گے، تو جاتی رہے گی۔"

❸ ان یہ کی تاکید بھی تھی کہ ہر روز کچھ حدیثیں بیان کیا کریں فرماتے تھے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ابھی تو کل بیان کیا ہے، لہٰذا آج نہ بیان کروں گا نہیں آج بھی بیان کرو اور پھر کل (آئندہ) بھی بیان کرنا۔

❹ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بھی آپس میں حدیث کے مذاکرہ کی تاکید کیا کرتے تھے۔[3] بلکہ وہ اس باب میں اتنے سخت تھے کہ شاگرد اگر درخواست کرتے کہ حدیثیں لکھوا دیجئے تو انکار کر دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ جس طرح ہم نے

---

[1] دارمی: ص ۷۸ [2] دارمی: ص ۷۸ [3] دارمی: ص ۷۷ و مستدرك: ۹٤/۱

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثوں کو سن کر حفظ کیا ہے تم بھی حفظ کرو۔[1]

۵ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے۔

”تذاکروا الحدیث فانکم الا تفعلوا یندرس“[2]

تَرجَمَہ: ”حدیثوں کو باہم یاد کیا کروں اس لئے کہ ایسا نہ کرو گے تو حدیث مٹ جائے گی۔“

٦ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی سخت تاکید تھی کہ۔

”تذاکروا الحدیث فان ذکر الحدیث حیاته“[3]

تَرجَمَہ: ”حدیثوں کا مذاکرہ کرتے رہو کہ یہی اس کے بقا کا سامان ہے۔“

۷ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

”تزاوروا وتدار سوا الحدیث ولا تترکوہ یندرس“[4]

تَرجَمَہ: ”ایک دوسرے سے ملتے رہو اور باہم حدیث کا مذاکرہ کرتے رہو اس کو چھوڑ نہ دو کہ فنا ہو جائے۔“

صحابہ کرام کے شاگرد اپنے اساتذہ کے ان احکام کا پورا احترام کرتے تھے، اور حدیثوں کے مذاکرہ سے کبھی غافل نہیں رہتے، چنانچہ دارمی (صفحہ ۷۹) اور تذکرہ (صفحہ ۱۱۹) میں عطاء کا بیان ہے کہ جب ہم حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے پاس سے حدیثیں سن کر اٹھتے تھے تو باہم مذاکرہ کرتے تھے ہمارے ہم سبقوں میں ابوزبیر کا حافظہ سب سے اچھا تھا، ان کو سب سے زیادہ حدیثیں یاد ہوتی تھیں۔

مستدرک (جلد ۱ صفحہ ۹۴) ابن بریدہ کا بیان ہے کہ ہم مسجد میں نماز کے بعد بیٹھ جاتے اور احادیث نبویہ کا مذاکرہ کرتے۔

---

[1] دارمی: ص ٦٦ [2] مستدرك: ٩٥/١

[3] مستدرك: ٩٥/١، دارمی ص ٧٩ [4] دارمی: ص ٧٩، كنز العمال: ٢٤٢/٥

دارمی (صفحہ۷۹) میں ہے کہ زہری عشاء کی نماز کے بعد حدیث کا مذاکرہ کرنے بیٹھے تو صبح تک یہ مشغلہ جاری رہا، دارمی میں یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ تم لوگ آپس میں ملتے رہتے ہو، اور کہیں ایک جگہ بیٹھ کر حدیث کا مذاکرہ بھی کرتے ہو؟ شاگردوں نے جواب دیا کہ ہم کو تو اس کا اتنا اہتمام ہے کہ ہمارا کوئی ساتھی کبھی غائب ہو جاتا ہے، تو اگر وہ کوفہ کے آخری سرے پر بھی ملتا ہے تو وہیں جا کر اس سے ملتے ہیں[1]

عہدِ تابعین رحمۃ اللہ علیہم

صحابہ کے بعد تابعین کا دور آیا تو وہ بھی اپنے شاگردوں کو حدیثوں کو حفظ کرنے کے لئے، دور اور مذاکرہ کی ہدایتیں کرتے رہے، چنانچہ دارمی میں عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ زہری اور علقمہ کے وہ ہدایات قریب قریب صحابہ کے مذکورہ بالا الفاظ میں منقول ہیں۔

انہی تاکیدوں کا نتیجہ تھا کہ حارث بن یزید عکلی، قعقاع بن یزید مغیرہ اور فضیل ء کی نماز کے بعد مذاکرہ کرنے کے لئے بیٹھتے تو صبح ہی کو یہ مجلس برخاست ہوتی۔[2]

یونس کا بیان ہے کہ جب ہم حسن بصری کے پاس سے حدیثیں سن کر اٹھتے تھے، تو آپس میں اس کا دور اور مذاکرہ کرتے تھے۔[3]

اسماعیل بن رجاء کا دستور تھا کہ کوئی نہ ملتا تو مکتب کے لڑکوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے حدیثیں بیان کرتے تاکہ حدیث کی مشق میں ناغہ نہ ہو، اور بھولنے نہ پائیں۔[4]

حفظِ حدیث کے لئے صحابہ و تابعین اور اتباعِ تابعین کا یہ غیر معمولی اہتمام آپ

---

[1] دارمی: ص ۷۹

[2] دارمی: ص ۷۸، تہذیب: ۲۷۰/۱۰

[3] دارمی: ص ۷۸

[4] دارمی: ص ۷۸، تہذیب التہذیب: ۲۹۶/۱

نے ملاحظہ کیا، اس کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ قدرت کی طرف سے ان حضرات کو کس قدر حیرت انگیز قوت یادداشت اور غیر معمولی حافظے عطا ہوئے تھے جس کی نظیر آج مشکل سے دستیاب ہوسکتی ہے، پس ان حالات اور واقعات کے باوجود یہ خیال قائم کرلینا کہ زبانی روایت پر دارومدار ہونے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہوگئیں، انصاف کا خون یا تاریخی حقائق سے چشم پوشی اور نری وہم پرستی ہے۔

صحابہ وتابعین کا غیر معمولی حافظہ

میں نے ابھی ابھی صحابہ وتابعین کی حیرت انگیز قوت یادداشت کا جو ذکر کیا ہے وہ محض خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ واقعات کی روشنی میں پوری ذمہ داری کے ساتھ میں نے اس بات کو لکھا ہے۔

اسماء رجال اور تذکرہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں پر تو میرے اس بیان کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہے، لیکن جن کو یہ موقع نہیں ملا ہے، ان کے اطمینان وتشفی کے لئے چند تاریخی واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

① صحابہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا نام کون نہیں جانتا، مورخ اسلام حافظ ذہبی کی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں خود انہی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ تم مال غنیمت سے حصہ نہیں مانگتے، میں نے عرض کیا کہ میں آپ سے علم کی دولت مانگتا ہوں، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری چادر میرے جسم سے اتار کر بیچ میں پھیلا دی، اور حدیثیں بیان کرنا شروع کیں، فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ چادر کو اپنے سینے سے ملالو، میں نے ایسا ہی کیا اس کے بعد سے میرا یہ حال ہوگیا ہے کہ ایک حرف بھی آپ کی حدیث کا مجھ کو نہیں بھولتا تھا۔[1]

② تابعین میں ایک مشہور ومعروف مفسر اور حافظ حدیث قتادہ ہیں، ان کی نسبت

---

[1] تذکرہ: ۱/۳۳

امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ قتادہ جو کچھ سن لیتے ان کو یاد ہو جاتا تھا، ان کے سامنے ایک دفعہ حضرت جابر ؓ کا صحیفہ (یعنی حضرت جابر ؓ کی روایت کی ہوئی حدیثوں کا مجموعہ) صرف ایک دفعہ پڑھ دیا گیا، ان کو کل یاد ہو گیا، خود قتادہ کا بیان ہے کہ میں نے کبھی کسی استاذ سے دہرانے کی خواہش نہیں کی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی چیز میرے کان میں پڑے اور وہ میرے دل میں بیٹھ نہ جائے۔[۱]

③ ایک نہایت جلیل القدر تابعی امام شعبی ہیں وہ ایک دن آنحضرت ﷺ کے غزوات کے واقعات بیان کر رہے تھے اتفاق سے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ (صحابی) کا ادھر سے گزر ہوا اور انہوں نے شعبی کا بیان کرنا سنا تو فرمایا کہ باوجودیکہ میں ان غزوات میں خود شریک تھا لیکن شعبی کو مجھ سے زیادہ واقعات یاد ہیں اور وہ مجھ سے زیادہ باخبر ہیں۔[۲]

شعبی خود کہتے تھے کہ میں نے کبھی کوئی چیز لکھی نہیں، لیکن حافظہ ایسا ہے کہ کسی نے کوئی حدیث بیان کی تو اس کو بھولا بھی نہیں اور یہ بھی نہیں ہوا کہ کبھی میں نے (استاذ سے) دوبارہ بیان کرنے کی خواہش کی ہو۔[۳] یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے اشعار ہر چیز سے کم یاد ہیں، تاہم اگر میں تم کو اشعار سنانا شروع کروں، تو ایک مہینہ تک کوئی شعر مکرر نہ سناؤں گا۔[۴]

④ ابو صالح سمان کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اعمش نے ان سے ایک ہزار حدیثیں سنی تھیں جیسا کہ خود اعمش کا بیان ہے۔[۵]

⑤ مکحول خود اپنی نسبت فرماتے تھے کہ میں نے جو چیز اپنے سینے میں رکھ لی پھر جس وقت چاہا اس کو اپنے سینے میں موجود پایا۔[۶]

⑥ زہری کا بیان ہے کہ میں نے جو علم اپنے سینے میں رکھ لیا اس کو کبھی نہیں بھولا۔[۷]

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۱۶ [۲] تذکرہ: ص ۷۷ [۳] تذکرہ: ۱/۷۹

[۴] تذکرہ: ۱/۷۹ [۵] تذکرہ: ۱/۸۲ [۶] تذکرہ: ۲/۱۰۲ [۷] تذکرہ: ۱/۱۰۳

سعید کا بیان ہے کہ زہری سے ایک شخص نے حدیثیں لکھوانے کی درخواست کی انہوں نے اس کو چار سو حدیثیں لکھوا دیں، ایک مہینہ کے بعد اس شخص سے پھر ملاقات ہوئی تو اس نے کہا وہ نوشتہ (جس میں چار سو حدیثیں لکھیں تھیں، کھو گیا، زہری نے دوبارہ وہ حدیثیں اس کو لکھوا دیں، جب اس نے دونوں نوشتوں کا مقابلہ کیا تو ایک حرف کا بھی فرق نہ تھا۔[1]

زہری کے بھتیجے کا بیان ہے کہ زہری نے صرف اسّی راتوں میں قرآن یاد کر لیا تھا۔ خود زہری کا بیان ہے کہ میں نے کسی حدیث کے متعلق کبھی دوبارہ بیان کرنے کے لئے استاذ سے نہیں کہا نہ کسی حدیث میں کبھی شک پیدا ہوا، صرف ایک دفعہ ایک حدیث میں شک ہوا تھا مگر میں نے اس کی نسبت بھی اپنے ہم سبق سے پوچھا تو وہ اسی طرح تھی جس طرح میں نے اس کو یاد کیا تھا۔[2]

تابعین کے بعد کے طبقے

صحابہ و تابعین کے بعد کے طبقوں میں بھی قوت یادداشت کی یہی فراوانی تھی بلکہ ان طبقوں میں حافظہ کی بعض مثالیں پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز ملتی ہیں۔

❶ مغیرہ ضبی (تبع تابعی) کے حافظہ کا حال خود ان کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ جو بات ان کے کان میں پڑ گئی، اس کو پھر کبھی نہیں بھولے۔[3]

❷ عمرو بن الحارث مصری (تبع تابعی) کی نسبت ابو حاتم رازی کا قول ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑے حافظ تھے، حافظہ میں ان کا ہمسر کوئی نہ تھا، اور ابن وہب کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ قوی حافظہ کا انسان نہیں دیکھا۔[4]

❸ معمر (تبع تابعی) کا بیان ہے کہ میں نے چودہ برس کی عمر میں قتادہ سے حدیثیں سنی تھیں جو کچھ اس وقت سنا تھا، وہ آج تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے سینہ میں لکھا

---

[1] تذکرہ: ۱/۱۰٤ [2] تذکرہ: ص ۱۰٤

[3] تذکرہ: ۱/۱۳۵ [4] تذکرہ: ۱/۱۷۳

ہوا ہے۔[1]

④ شعبہ (تابعی) کو اتنی کثرت سے حدیثیں یاد تھیں، کہ ابوداؤد طیالسی نے ان سے سات ہزار حدیثیں سنی تھیں اور غندر نے بھی اتنی ہی حدیثیں ان سے سنی تھیں۔

شعبہ کا خود اپنا بیان ہے کہ صرف ایک ابوالزبیر سے سنی ہوئی مجھ کو سو حدیثیں ازبر ہیں۔[2]

⑤ حماد بن سلمہ (تبع تابعی) کے پاس قیس بن سعد کی مرویات کے سوا کوئی حدیث لکھی ہوئی نہ تھی، بااین ہمہ یحییٰ بن الفریس کے پاس حماد سے سنی ہوئی دس ہزار حدیثیں تھیں اور عمرو بن عاصم کا بیان ہے کہ میں نے حماد سے دس ہزار سے بھی زیادہ حدیثیں سن کر لکھی ہیں۔[3]

⑥ سفیان ثوری کا بیان ہے میں نے اپنے سینہ کو (احادیث کی) جو امانت بھی سپرد کر دی، اس نے کبھی خیانت نہیں کی یحییٰ قطان کا بیان ہے کہ میں نے سفیان سے زیادہ حدیث کا حافظ نہیں دیکھا۔[4]

⑦ اسرائیل کا بیان ہے کہ میں ابواسحاق کی مرویات کو اس طرح یاد رکھتا تھا جیسے قرآن کی سورتوں کو۔[5]

⑧ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہیب اپنی یاد سے حدیثیں لکھواتے تھے۔[6] باوجودیکہ ان کی روایات بہت زیادہ ہیں۔

⑨ ہشیم کے پاس بیس ہزار حدیثیں تھیں، ابن مہدی کا بیان ہے کہ وہ سفیان ثوری سے بھی بڑھ کر حافظ حدیث تھے۔[7]

ثوری کا حال اوپر پڑھ چکے ہو۔

⑩ داؤد ضبی کا بیان ہے کہ اسماعیل بن عیاش کے ہاتھ میں اس نے کتاب کبھی

---

[1] تذکرہ: ۱/۱۷۹ [2] تذکرہ: ۱/۱۸۳، ۱/۱۸٤ [3] تذکرہ: ۱/۱۹۰

[4] تذکرہ: ۱/۱۹۱ [5] تذکرہ: ۱/۱۹۹ [6] تذکرہ: ۱/۲۱۷ [7] تذکرہ: ۱/۲۲۹

نہیں دیکھی وہ اپنی یاد سے حدیثیں سناتے تھے اور ان کو تیس ہزار حدیثیں یاد تھیں۔[1]

⑪ ابن عیینہ کے پاس سات ہزار کے قریب حدیثیں تھیں اور ان سب کو وہ اپنی یاد سے بیان کرتے تھے۔[2]

⑫ ابن المبارک کے والد ایک دفعہ ان پر خفا ہوئے تو کہا کہ تیری کتابیں میں پا گیا تو جلادوں گا، ابن المبارک نے کہا کہ اس سے کیا ہو جائے گا وہ سب میرے سینہ میں ہیں، علی بن الحسن بن شقیق کا بیان ہے کہ ایک رات ابن المبارک مسجد سے نکلے میں بھی ساتھ ہولیا، دروازہ پر انہوں نے حدیث کا ذکر چھیڑ دیا، مذاکرہ کا سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ جب فجر کی اذان کے لئے مؤذن آیا تو ہم ابھی مذاکرہ ہی کر رہے تھے۔[3]

⑬ عیسیٰ بن یونس کو اپنی حدیثیں اس قدر یاد تھیں کہ فرماتے تھے، اگر میری کتاب میں کہیں ایک واو بھی کوئی بڑھا دے تو وہ مجھ سے چھپ نہیں سکتا۔[4]

⑭ یحییٰ ابن الیمان کو ایک مجلس میں پانچ سو حدیثیں یاد ہو جاتی تھیں۔[5]

⑮ ابو معاویہ نابینا تھے، اس کے باوجود علی بن المدینی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے ڈیڑھ ہزار حدیثیں سن کر لکھی ہیں جریر کا بیان ہے کہ ہم اعمش کے پاس سے حدیثیں سن کر اٹھتے تھے تو باہم مذاکرہ کرتے تھے، ہم سب میں ابو معاویہ (نابینا) سے زیادہ کسی کو یاد نہ ہوتا تھا، خود ابو معاویہ کا بیان ہے کہ آنکھ والے لوگ اعمش کی مجلس میں میرے محتاج تھے، اعمش کے کل شاگرد میرے دروازہ پر آتے تھے اور میں ان کی ساری سنی ہوئی حدیثیں بول دیتا تھا وہ لکھ لیتے تھے۔[6]

⑯ مروان بن معاویہ کو اپنی کل حدیثیں یاد تھیں۔[7]

⑰ ابن معین کا بیان ہے کہ حفص بن غیاث نے بغداد اور کوفہ میں جتنی حدیثیں بیان کی ہیں سب اپنی یادداشت سے بیان کی ہیں، کتاب کبھی نہیں نکالی، اور تین چار

---

[1] تذکرہ: ٢٣٤/١ [2] تذکرہ: ٢٤٢/ [3] تذکرہ: ٢٥٥/١

[4] تذکرہ: ٢٥٩/١ [5] تذکرہ: ١٦٣/١ [6] تذکرہ: ٢٧١/١ [7] تذکرہ: ٢٧٢/١

ہزار حدیثیں ان کی یاد سے لوگوں نے لکھی ہیں۔[1]

⑱ ابن مہدی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سفیان نے مجھ سے کہا کہ کسی محدث کو مذاکرہ کرنے کے لئے میرے پاس لاؤ، میں یحییٰ قطان کو ساتھ لے گیا سفیان نے ان سے مذاکرہ کیا تو ہکا بکا رہ گئے۔[2]

⑲ ولید بن مسلم کو بڑی بڑی لمبی حدیثیں اور ملاحم کی پیشن گوئیوں والی روایتیں خوب یاد تھیں، ابواب بھی ان کو ازبر تھے۔[3]

⑳ احمد بن صالح کا بیان ہے کہ ابن وہب نے ایک لاکھ حدیثیں بیان کی ہیں۔[4]

㉑ امام احمد کا قول ہے کہ میں نے وکیع سے بڑھ کر کسی کو حافظ نہیں پایا ابو حاتم کا قول ہے کہ وکیع ابن المبارک سے بھی بڑھ کر حافظ تھے، ابوداؤد کا بیان ہے کہ وکیع کے ہاتھ میں حدیث بیان کرنے کے وقت بھی کتاب نہیں دیکھی گئی۔[5]

㉒ وکیع کا بیان ہے کہ محاربی لمبی حدیثوں کے بڑے حافظ تھے۔[6]

㉓ یزید بن ہارون کا خود اپنی نسبت یہ بیان ہے کہ مجھ کو بیس ہزار حدیثیں سند کے ساتھ یاد ہیں اور وہ بھی اتنی پکی کہ ان میں کوئی ایک حرف بھی ملا دے تو جانوں۔

زیاد بن ایوب کا بیان ہے کہ میں نے یزید کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی۔[7]

㉔ زیاد بن ایوب کا بیان ہے کہ ابن علیہ کے ہاتھ میں میں نے کبھی کتاب نہیں دیکھی، ابوداؤد کا بیان ہے کہ ابن علیہ سے حدیث میں کہیں بھول چوک نہیں ہوئی۔[8]

㉕ قواریری کا بیان ہے کہ ابن مہدی نے بیس ہزار حدیثیں اپنی یاد سے مجھ کو لکھوائیں، ذہلی کا بیان ہے کہ ابن مہدی کے ہاتھ میں میں نے کبھی کتاب نہیں

---

[1] تذکرہ: ۲۷٤/۱

[2] تذکرہ: ۲۷٦/۱

[3] تذکرہ: ۲۷۹/۱

[4] تذکرہ: ۲۸۰/۱

[5] تذکرہ: ۲۷۳/۱

[6] تذکرہ: ۲۸۷/۱

[7] تذکرہ: ۲۹۲/۱

[8] تذکرہ: ۲۹٦/۱

دیکھی۔[١]

٢٦ محمد بن عبید طنافسی کی حدیثیں چار ہزار تھیں اور سب از بر تھیں۔[٢]

٢٧ ابوداؤد طیالسی کی یاد سے لوگوں نے چالیس ہزار حدیثیں لکھیں۔[٣]

٢٨ ابواحمد زبیری کے پاس سفیان ثوری کی احادیث کا بہت بڑا مجموعہ تھا، فرماتے تھے کہ وہ مجموعہ چوری ہو جائے تو مجھ کو اس کی کچھ پرواہ نہیں، وہ سارے کا سارا مجھ کو یاد ہے۔[٤]

٢٩ ابوعاصم کو ایک ہزار کھری حدیثیں یاد تھیں اور ہمیشہ اپنی یاد سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔[٥]

٣٠ علی بن الحسن بن شقیق ابن المبارک کی کتابوں کے سب سے بڑے حافظ تھے۔[٦]

٣١ سلیمان بن حرب کی نسبت ابوحاتم کا بیان ہے کہ ان کی حدیثوں میں سے دس ہزار حدیثیں ظاہر ہوئی ہیں، اور میں نے ان کے ہاتھ میں کتاب کبھی نہیں دیکھی۔[٧]

٣٢ سعید بن منصور المتوفی ٢٢٧ھ نے دس ہزار حدیثیں اپنی یاد سے لکھوائیں، جیسا کہ حرب کرمانی کا بیان ہے۔[٨]

٣٣ ابوزرعہ کا بیان ہے کہ امام احمد کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔

٣٤ ابوداؤد خفاف کا بیان ہے کہ اسحاق بن راہویہ نے گیارہ ہزار حدیثیں اپنی یاد سے لکھوائیں، پھر ان کو اپنی کتاب سے پڑھ کر سنایا، تو نہ کہیں ایک حرف گھٹا نہ بڑھا۔

٣٥ امام بخاری کے حافظہ کا حال حاشد بن اسماعیل نے یوں بیان کیا ہے کہ بخاری ہمارے ساتھ حدیث سننے کے لئے محدثین کی مجلسوں میں جایا کرتے تھے، تو لکھتے نہ

---

[١] تذکرہ: ١/٣٠٢، ٣٠٣

[٢] تذکرہ: ص ٣٠٥

[٣] تذکرہ: ص ٣٢١

[٤] تذکرہ: ١/٣٢٥

[٥] تذکرہ: ١/٣٣٤

[٦] تذکرہ: ١/٣٣٧

[٧] تذکرہ: ١/٣٣٥

[٨] تذکرہ: ٢/٥

تھے، بہت دنوں تک ہم یہی دیکھتے رہے ان سے اس باب میں ہم کچھ کہتے تو وہ کچھ نہ بولتے ایک دن انہوں نے کہا کہ تم لوگ مجھ کو بہت کہتے رہے، لاؤ مجھ کو دکھاؤ تم نے اب تک کتنی حدیثیں لکھی ہیں، ہم نے دکھایا تو پندرہ ہزار سے زیادہ حدیثیں تھیں، اس کے بعد انہوں نے ہماری بیاضیں ہم کو دے دیں اور ان حدیثوں کو اپنی یاد سے زبانی سنانا شروع کیا، تو کل کی کل سنادیں، ان کی یادداشت اتنی درست تھی کہ ہم نے ان کی یاد سے اپنی بیاضوں کی غلطیاں ٹھیک کیں، اس کے بعد بخاری نے کہا کہ تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں اپنا وقت برباد کرنے کے لئے روزانہ آتا ہوں۔ [1]

خود بخاری فرماتے تھے کہ مجھ کو ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دو لاکھ غیر صحیح یاد ہیں۔ [2]

بخاری کا یہ واقعہ بھی نہایت مشہور ہے کہ جب وہ بغداد گئے ہیں تو وہاں کے محدثین نے متفق ہوکر ان کے حافظہ کا امتحان کرنا چاہا اور اس کی یہ صورت تجویز ہوئی کہ سو حدیثیں چھانٹ کر ان کی سند و متن کو الٹ پلٹ دیا گیا، اس کی سند اس کے ساتھ اور اس کی اس کے ساتھ جوڑ دی گئی، پھر دس محدث چنے گئے، اور ان میں سے ہر ایک کو دس دس حدیثیں دی گئیں کہ جب مجلس میں سب لوگ باطمینان بیٹھ جائیں تو ایک آدمی آگے بڑھ کر ایک حدیث الٹی و پلٹی سند و متن سے پڑھ کر امام بخاری سے پوچھے کہ آپ کو یہ حدیث معلوم ہے، اسی طرح دسوں حدیثوں کو پڑھ پڑھ کر پوچھتا جائے، جب وہ فارغ ہو جائے تو دوسرا آگے بڑھے، اسی طرح دسوں آدمی پوچھیں، یہ طے کر کے بخاری کو ایک مجلس میں دعوت دے کر بلایا گیا اور بہت بڑا مجمع کیا گیا، اس مجمع میں طے شدہ تجویز کے مطابق جو لوگ مقرر ہوئے تھے، انہوں نے پوچھنا شروع کیا، بخاری نے ہر سوال کے جواب میں کہا کہ میں اس کو نہیں جانتا، جب وہ

---

[1] تذکرہ: ٢/١٣٣، مقدمہ فتح الباری: ص ٥٦٤

[2] تذکرہ: ٢/١٢٣، مقدمہ: ص ٥٧٥

دسوں آدمی پوچھ چکے، تو بخاری نے سب سے پہلے پوچھنے والے کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے پہلی حدیث یوں پڑھی ہے، حالانکہ وہ اس طرح ہے اور دوسری حدیث کی سند یہ بیان کی ہے حالانکہ اس کی سند یوں ہے، اسی طرح فرداً فرداً ہر حدیث کی سند و متن کی نسبت بیان کر گئے اس وقت لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور ان کے بے مثال حافظہ کے قائل ہو گئے۔[1]

(۳۶) امام ترمذی کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ مکہ کے راستہ میں ان کو معلوم ہوا کہ فلاں محدث آرہے ہیں، ترمذی نے اس سفر سے پہلے اس محدث کی روایت کی ہوئی حدیثیں کسی شخص سے لے کر نقل کر لی تھیں، اور ان کا خیال تھا کہ وہ اجزاء ان کے ساتھ موجود ہیں، اس لئے چاہا کہ اس محدث سے وہ اجزاء سن کر باقاعدہ سماع حاصل کریں لیکن تلاش کیا تو وہ اجزاء سفر میں ساتھ نہ تھے دل نے گوارا نہ کیا کہ یہ سنہری موقع ہاتھ سے چلا جائے اس لئے ایک سادی بیاض ہاتھ میں لے کر اس محدث کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ کی کچھ مرویات میں نے ایک شخص سے لے کر نقل کی ہیں آپ اپنی زبان سے ان حدیثوں کو سنا دیجئے انہوں نے قبول کر لیا، ترمذی وہی سادی بیاض ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئے اور محدث نے وہ حدیثیں اپنی یاد سے سنانا شروع کیں، اتفاق سے محدث کی نظر بیاض پر جا پڑی دیکھا تو وہ سادی تھی، محدث نے خفا ہو کر کہا کہ تم کو مجھ سے شرم نہیں آتی، ترمذی نے اس کے بعد قصہ سنایا اور کہا کہ وہ اجزاء اگرچہ ساتھ نہیں ہیں مگر اس میں کی سب حدیثیں مجھ کو زبانی یاد ہیں، محدث نے کہا اچھا سناؤ ترمذی نے مسلسل تمام حدیثیں سنا دیں، محدث نے پوچھا کہ تم نے ان کو رٹ لیا تھا ترمذی نے کہا نہیں، پھر کہا آپ ان کے علاوہ دوسری حدیثیں سنا کر ابھی امتحان کر لیجئے، چنانچہ محدث نے اپنی مخصوص چالیس حدیثیں سنا کر ان سے کہا کہ اب یہ حدیثیں تم سناؤ، ترمذی نے اسی وقت اول سے آخر تک سنا

---

[1] مقدمہ: ص ۵۷۳

دیں وہ محدث محو حیرت ہو گئے اور فرمایا کہ میں نے تم سا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔[۱]

㊲ ایک شخص ابوزرعہ کے پاس آیا، اور کہا کہ میرے منہ سے یہ نکل گیا ہے کہ اگر ابو زرعہ کو ایک لاکھ حدیثیں یاد نہ ہوں تو میری بی بی کو طلاق ابوزرعہ نے کہا تمہاری بی بی مطلقہ نہیں ہوئی (یعنی مجھ کو اتنی حدیثیں یاد ہیں)۔[۲]

ابوزرعہ فرماتے تھے کہ ایک لاکھ حدیثیں مجھ کو اس طرح یاد ہیں جس طرح کسی کو قل ہو اللہ یاد ہوتی ہے۔[۳]

نیز فرماتے تھے کہ میں نے اپنے ہاتھ سے جو دفتر حدیثوں کے لکھے ہیں، ان میں سے کسی کسی کو لکھے ہوئے پچاس برس ہو چکے ہیں اور اس وقت سے آج تک اس کو پھر دیکھا بھی نہیں ہے با ایں ہمہ میں ہر حدیث کی نسبت جانتا ہوں کہ وہ کس کتاب میں کس ورق میں کس صفحہ میں اور کس سطر میں ہے۔[۴]

㊳ ابواللیث کا اپنی نسبت بیان ہے کہ مجھ کو دس ہزار غیر مکرر حدیثیں یاد ہیں۔[۵]

㊴ ابن عاصم کی کتابیں ایک ہنگامہ میں ضائع ہو گئیں، تو انہوں نے اپنی یاد سے پچاس ہزار حدیثیں لکھ لیں۔[۶]

㊵ خطیب کا بیان ہے کہ جزرہ ایک مدت تک اپنی یاد سے حدیثیں بیان کرتے رہے اس لئے کہ کوئی کتاب ساتھ نہیں لی تھی۔[۷]

میں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعات پڑھتے پڑھتے اب آپ گھبرا گئے ہوں گے اس لئے اتنی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ اس موضوع پر تو مستقل ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

روایت میں محدثین کی بے نظیر احتیاط

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی بہت زیادہ قابل توجہ ہے، اور وہ یہ کہ آنحضرت

---

[۱] تهذيب التهذيب: ٩/٣٨٦، تذكره: ٢/١٨٨ — [۲] تذكره: ٢/١٧٤

[۳] تهذيب: ٧/٣٣ — [۴] تهذيب: ٧/٣٣ — [۵] تذكره: ٢/١٤٩

[۶] تذكره: ٢/١٩٤ — [۷] تذكره: ٢/١٩٥

صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اپنی حدیثوں کی اشاعت وتبلیغ کے [illegible] تاکیدیں کی ہیں، وہاں اس بات کی بھی نہایت سخت تاکید کی ہے کہ کوئی [illegible] بات اپ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے، اس لئے ابتداء ہی سے محدثین کا گروہ حدیثوں کی روایت کرنے میں بے حد محتاط رہا ہے، چنانچہ بعض صحابہ صرف اس ڈر سے کہ بیان کرنے میں کچھ کمی بیشی نہ ہو جائے بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے، جیسا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ صحیح بخاری (جلد ا صفحہ ۲۱) میں مذکور ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ جس حدیث میں ان کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ یہ حدیث خوب اچھی طرح یاد نہیں ہے، تو وہ اس کو بیان ہی نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ غلطی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں بیان کرتا۔[1]

امام ربانی محمد باقر کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو سب سے زیادہ اس بات کا اہتمام تھا کہ حدیث میں ذرہ برابر بھی کوئی کمی بیشی نہ ہو۔[2]

چنانچہ صحیح مسلم (جلد ا صفحہ ۳۲) میں ہے ایک دفعہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی "بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا اللّٰه وان محمدا رسول اللّٰه واقام الصلوة وايتاء الزكوة وصيام رمضان والحج" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بیان کرنے کے بعد مجلس میں کسی شخص نے اس حدیث کو دہرایا، تو یوں کہہ دیا "والحج و صيام رمضان" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو فوراً ٹوکا اور فرمایا، یوں نہیں بلکہ "وصيام رمضان والحج" میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سنا ہے۔

غور فرمایئے کہ باوجودیکہ معنی میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی تھی پھر بھی جس ترتیب سے حدیث کے الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے تھے، اس میں یہ معمولی سا تغیر بھی ان کو گوارا نہ تھا، دارمی (صفحہ ۵۱) میں عبداللہ بن عمر کا ایسا ہی ایک دوسرا واقعہ

---

[1] دارمی: ص ۴۲ [2] تذکرہ: ص ۳۷

ایک دوسری حدیث کے باب میں بھی مذکور ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی نسبت تذکرہ الحفاظ میں مذکور ہے:

”کان ممن یتحری فی الاداء ویشدد فی الروایة ویزجر تلامذته عن التهاون فی ضبط الالفاظ.“[1]

ترجمہ: ”ان کا شمار ان حضرات میں ہے جن کو ادائے حدیث میں بے حد احتیاط اور روایت کے باب میں بڑا تشدد تھا اور وہ اپنے شاگردوں کو الفاظ[2] حدیث کے ضبط کرنے میں سستی پر بہت ڈانٹتے رہتے تھے۔“

حضرت زید بن ارقم کا جب بڑھاپا آیا، اس وقت کوئی شخص حدیث بیان کرنے کو کہتا تو فرماتے کہ اب ہم بوڑھے ہو گئے اور آنحضرت ﷺ کی حدیث بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے۔[3]

اسی احتیاط کا تقاضا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ جب تم حدیث کی روایت کرنے کا ارادہ کرو تو پہلے اس کو تین دفعہ دہرالیا کرو۔[4]

نیز اسی شدت احتیاط ہی کی وجہ سے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہم کی بڑی تاکید تھی کہ آنحضرت ﷺ سے حدیثوں کی روایت کم کی جائے۔

صحابہ کرام کے یہ واقعات پڑھنے کے بعد آپ ہی انصاف سے کہئے کہ جس جماعت کو اس قدر احتیاط کا پاس و لحاظ ہو اس کی نسبت یہ خیال قائم کرنے کا تو کسی درجہ میں کوئی امکان ہی نہیں کہ اس نے جان بوجھ کر غلط تو درکنار کوئی مشکوک ہی بات آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کی ہوگی۔

---

[1] تذکرہ الحفاظ: ۱/۱۳

[2] امام مالک کا یہ حال تھا کہ وہ بے اور تے کا بھی خیال رکھتے تھے۔ (تذکرہ: ۱/۱۹۸)

[3] ابن ماجہ: ص ٤ [4] دارمی: ص ۷۸

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ جب احتیاط کا یہ عالم تھا اور حدیثوں کی روایت سے بھی چارہ کار نہ تھا تو لازمی طور پر حدیثوں کو یاد رکھنے اور ان کو بعینہٖ حافظہ میں محفوظ رکھنے کا بھی انتہائی اہتمام ہوگا اس حالت میں بھول چوک سے بھی حدیثوں کا کچھ سے کچھ ہونا بعید از قیاس ہے۔

خصوصاً جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ شروع ہی سے اس کا بھی اہتمام تھا کہ ایک شخص کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو مزید اطمینان کے لئے کوئی دوسرا اس کا موید تلاش کیا جاتا تھا جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ (جلد۱ صفحہ۲) میں مذکور ہے کہ جب حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے یہ بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے دادی کو پوتے کی میراث سے چھٹا حصہ دلوایا ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا کہ کوئی اور بھی آنحضرت ﷺ سے اس بات کو نقل کرنے میں تمہارا شریک ہے؟ معلوم ہوا کہ حضرت محمد بن سلمہ رضی اللہ عنہ بھی اس کو جانتے ہیں، چنانچہ انہوں نے آکر شہادت دی تو حضرت ابوبکر نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث بیان کی تو انہوں نے حکم دیا کہ اس پر کوئی دوسری شہادت پیش کرو، حضرت ابوموسیٰ انصار کے مجمع میں گئے اور ان سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی نے آنحضرت ﷺ سے فلاں حدیث سنی ہے انہوں نے کہا کہ ہم سب نے یہ حدیث سنی ہے، حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک انصاری کو ساتھ لیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ان سے شہادت دلوائی۔[1]

خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایک حدیث کو بیان کرنا شروع کیا تو فرمایا کہ ڈر تو لگتا ہے کہ کوئی کمی بیشی نہ ہو جائے، لیکن عمار نے بھی میرے ساتھ اس حدیث کو سنا ہے اس لئے میں بیان کرتا ہوں، تم عمار کے پاس آدمی بھیج کر ان سے بھی تصدیق

---

[1] تذکرہ: ٦/١

کرالو، چنانچہ عمار کو بلا کر پوچھا گیا تو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان کی تصدیق و تائید کی۔[1]

ان واقعات کے ذکر کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ جب ایک کے بیان کی دوسرے سے تصدیق کرانے کا بھی دستور تھا تو اس کے باوجود یہ خیال کرنا کہ صرف حافظہ پر مدار ہونے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہوگئی ہوں گی، نرا وہم ہی وہم ہے، تنہا ایک آدمی کے بیان میں ایسا شک کیا بھی جا سکے تو دو ہو جانے کی صورت میں ایسا شک قطعاً درخور التفات نہیں ہے۔

بلکہ میں تو جرأت کر کے یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ ایسا شکی مزاج انسان قرآنی تعلیمات کی روح سے یقیناً بے بہرہ ہے، قرآن پاک نے جہاں یہ تعلیم دی ہے کہ دو پسندیدہ مرد گواہ بنانے کے لئے نہ ملیں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں گواہ بنالی جائیں، وہاں خود ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ دو عورتوں کو گواہ بنانے کے لئے اس لئے کہا کہ اگر ایک عورت بھولے بھٹکے گی تو دوسری عورت یاد دلا دے گی ﴿ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخری﴾[2]

حدیث کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والے آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ قرآن پاک نے دو ہو جانے کے بعد اس احتمال وشک کا کہ ممکن ہے دو بھی بھول جائیں اور دونوں کو سہو ونسیان ہو جائے، قطعاً اعتبار نہیں کیا اور اس پر بھی غور کریں کہ دو عورتوں کے باب میں ایسے شک ووہم کا قرآن نے اعتبار نہیں کیا تو دو مردوں کے باب میں اس کا کب اعتبار ہو سکتا ہے، جب کہ قرآن پاک کے اسی مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مرد اس باب میں دو عورتوں کے برابر ہے۔

محدثین پر سلطنت کی ہوا خواہی کا الزام

حدیث کی بے اعتباری کی ایک وجہ "حق گو" صاحب نے یہ بھی تراشی اور گڑھی

---

[1] ابو داؤد طیالسی: ص ۱۰ [2] بقرہ

ہے کہ محدثین نے حدیثوں میں سلطنت کے جذبات وعواطف کی رعایت کی ہے۔

محدثین کے اعلیٰ کیرکٹر ان کی نہایت بلند اخلاقی جرأت اور ان کی بے مثل صداقت وامانت پر ’’حق گو‘‘ صاحب کا یہ نہایت سخت حملہ ہے، ’’حق گو‘‘ صاحب کو اس لحاظ سے تو ہم معذور سمجھتے ہیں کہ غلام قوم کا ایک غلام فرد اور وہ بھی حکومت کا تنخواہ دار نوکر اس اخلاقی جرأت کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو محدثین کا طرۂ امتیاز تھی۔

لیکن تاریخی حقائق سے چشم پوشی کرنے میں وہ کسی طرح معذور قرار نہیں دیئے جا سکتے، تاریخ دان حضرات جانتے ہیں کہ محدثین میں بہت سے ایسے افراد ہیں جن کو حکومت سے ایسا سخت اختلاف تھا جس کی وجہ سے وہ حکومت کے مورد عتاب تھے، مثلاً۔

❶ سعید بن جبیر کو حجاج کی حکومت سے ایسا اختلاف تھا کہ اسی اختلاف کی بنا پر ان کو حجاج نے نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالا۔[1]

❷ یحییٰ بن ابی کثیر کو حکومت بنی امیہ پر نکتہ چینی کرنے کی وجہ سے بڑے مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا حتیٰ کہ مار بھی کھانا پڑی۔[2]

محدثین میں بہت سے وہ لوگ تھے جنہوں نے بہت بڑے جابر بادشاہوں کے سامنے ان پر نکتہ چینی کی اور حق بات کہنے میں جان کی پرواہ نہیں کی۔

❸ اس سلسلہ میں امام اوزاعی کا واقعہ سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے، حافظ ذہبی نے سفیان وغیرہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب خلیفہ عباسی کا چچا عبداللہ ابن علی شام میں داخل ہوا، اور بنو امیہ کو چن چن کے مروا چکا تو ایک دن اس نے اس طرح دربار سجانے کا حکم دیا کہ ایک صف ایسے جوانوں کی آراستہ کی جائے جن کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں ہوں، دوسری صرف ان کی ہو جن کے ہاتھ میں بلم ہوں، تیسری صف میں وہ سپاہی ہوں جن کے ساتھ کافر کوب ہوں، اور چوتھی صف

---

[1] تذکرہ: ۷۲/۱ [2] تذکرہ: ۱۲۱/۱

میں وہ کھڑے کئے جائیں جن کے ساتھ گرز ہوں، جب حکم کے مطابق دربار سج چکا تو ایک پیادہ بھیج کر اس نے اوزاعی کو بلوایا، اوزاعی بارگاہ کے دروازہ پر پہنچے تو سواری سے اتارے گئے اور دائیں بائیں سے دو سپاہی ان کے دونوں بازو تھام کر صفوں کے بیچ میں لے چلے جب اتنے قریب پہنچ گئے جہاں سے عبداللہ ان کی بات سن سکے، تو وہاں ان کو کھڑا کر دیا اس کے بعد عبداللہ اور اوزاعی میں حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

عبداللہ۔ تم عبدالرحمٰن بن اوزاعی ہو۔

اوزاعی۔ ہاں، خدا امیر کی اصلاح فرمائے۔

عبداللہ۔ بنی امیہ کے قتل کے باب میں تمہارا کیا خیال ہے۔

اوزاعی۔ آپ سے اور ان سے کچھ معاہدے تھے جن کی پابندی اور عہد کا ایفاء ان پر لازم تھا۔

عبداللہ۔ اجی صاحب! اس کو چھوڑیئے، فرض کیجئے کہ ہمارے ان کے کوئی معاہدہ اور ہم سے ان سے کوئی عہد و پیمان نہ رہا ہو۔

اوزاعی (نے دیکھا کہ اب صاف صاف جواب کے سوا چارہ کار نہیں ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ صاف جواب دینے کے بعد جان بچنا بھی ممکن نہیں۔ مرنے کو کس کا دل چاہتا ہے، مگر میں نے سوچا کہ اللہ کے حضور میں ایک دن کھڑا ہونا ہے، اس لئے میں نے نڈر ہو کر کہا کہ) اس صورت میں ان کا قتل آپ پر حرام تھا، یہ سنتے ہی وہ آگ بگولا ہو گیا گردن کی رگیں پھول گئیں اور سرخ سرخ آنکھیں نکال کر بولا۔

عبداللہ۔ یہ تم نے کیسے کہا، اور کیوں کہا؟

اوزاعی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمان کا خون تین ہی صورتوں میں روا ہو سکتا ہے، شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے، یا کسی کو قتل کر دے۔ یا مرتد ہو جائے اور بنو امیہ جن کو تم نے قتل کرایا ہے، ان میں سے کسی جرم کے مرتکب نہ تھے۔

عبداللہ۔ اجی کیا دیانۃً حکومت وخلافت ہمارا (ہاشمیوں کا) ہی حق نہیں ہے۔

اوزاعی۔ وہ کیسے؟

عبداللہ۔ کیا آنحضرت ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ (ہاشمی) کو اپنا وصی نہیں بنا گئے تھے۔

اوزاعی۔ اگر وصی بنا گئے ہوتے تو حضرت علی صفین کے موقع پر دو شخصوں کو حکم مان کر یہ نہ کہتے کہ تم جس کو حاکم وخلیفہ مقرر کر دو مجھے قبول ومنظور ہے۔

یہ سن کر عبداللہ بالکل خاموش ہو گیا، اس کے غصہ کا پارہ آخری ڈگری پر پہنچ چکا تھا، اور امام اوزاعی خیال کر رہے تھے کہ اب میرا سر میرے سامنے گرا چاہتا ہے کہ اتنے میں عبداللہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس کو دربار سے نکالو، اوزاعی دربار سے نکل آئے لیکن ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے، کہ دیکھا کہ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے پاس چلا آرہا ہے، یہ سمجھے کہ میرا سر قلم کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے، اس لئے جلدی سے اپنی سواری سے اترے کہ دو رکعت نماز پڑھوں، اور اللہ اکبر کہہ کے نیت باندھ لی، ابھی نماز ہی میں تھے کہ سوار آپہنچا، جب فارغ ہوئے تو اس نے سلام کیا اور کہا کہ امیر نے یہ اشرفیاں آپ کے پاس بھجوائی ہیں، اوزاعی فرماتے ہیں کہ میں نے ان اشرفیوں کو گھر پہنچنے سے پیشتر ہی تقسیم کر کے ختم کر دیا۔[1]

④ ابن ابی ذئب کی جرات کا یہ عالم تھا کہ ابوجعفر منصور جیسے ہیبت و رعب بادشاہ کے سامنے بھی وہ حق بات کہنے میں ذرا نہ دبے اور صاف کہہ دیا کہ تیرے دروازہ پر کھلم کھلا ظلم کی گرم بازاری ہے۔[2]

ابونعیم کا بیان ہے کہ جس سال خلیفہ منصور نے حج کیا ہے، اسی سال مجھ کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی تھی یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ منصور جب مکہ معظمہ پہنچا تو اس نے ابن ابی ذئب کو بلا بھیجا جب وہ آئے تو دارالندوہ میں ان کو اپنے ساتھ بٹھا

---

[1] تذکرہ: ١/١٧٠ [2] تذکرہ: ١/١٨٠

کر پوچھا کہ حسن بن زید (علوی جو منصور کی طرف سے مدینہ کے قاضی تھے، مگر منصور کسی بات پر ان سے برہم ہو گیا تھا اور قضاء سے برطرف کر کے ان کو جیل خانہ بھجوا دیا تھا) کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟ ابن ابی ذئب نے کہا وہ انصاف شعار و عدل گستر تھے، منصور نے کہا کہ اور میری نسبت کیا رائے ہے؟ ابن ابی ذئب نے پہلے سکوت کیا لیکن منصور نے بار بار پوچھا تو ابن ابی ذئب نے خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کر کے صاف فرمایا کہ اس گھر کے مالک کی قسم کہ تو بے انصاف و ناحق پرست ہے۔

منصور کے دربان ربیع نے یہ تلخ اور بے باکانہ جواب سن کر ابن ابی ذئب کی داڑھی پکڑ لی، مگر منصور نے اس کو ڈانٹا کہ حرام زادے چھوڑ دے۔

ابن ابی ذئب منصور کے بیٹے مہدی کے عہد حکومت میں بھی زندہ تھے، چنانچہ جس وقت مہدی نے حج کیا ہے اور حج سے فارغ ہو کر روضہ اطہر کی زیارت کے لئے مسجد نبوی میں حاضری دی تو مسجد میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جو اس کو دیکھ کر تعظیماً کھڑا نہ ہو گیا ہو صرف ایک ابن ابی ذئب تھے جنہوں نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی، کسی نے کہا کہ حضرت کھڑے ہو جائیے، یہ امیر المؤمنین ہیں، تو برجستہ فرمایا "انما یقوم الناس لرب العالمین" کہ میاں رب العالمین کے لئے لوگ کھڑے ہوا کرتے ہیں۔

مہدی یہ جواب سن کر کانپ گیا اور اس نے ڈانٹا کہ ان کو نہ چھیڑو میرے بدن کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا۔[1]

⑤ یزید بن ابی حبیب مصری ایک دفعہ بیمار ہوئے تو مصر کا حاکم حوثرہ ان کی عیادت کو آیا، باتوں باتوں میں اس نے یہ مسئلہ پوچھ لیا کہ کپڑے میں مچھر یا کھٹمل کا خون لگا ہو تو اس سے نماز ہوگی یا نہیں، یزید نے یہ سن کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کچھ جواب نہ دیا، جب وہ اٹھ کر جانے لگا تو یزید نے اس کی طرف دیکھ کر کہا کہ

---

[1] تذکرہ: ۱/۱۸۱

روزانہ کتنی مخلوق خدا کا خون بہاتے ہو تو کچھ نہیں اور کھٹمل یا مچھر کے خون کا مسئلہ دریافت کرنے آئے ہو۔[۱]

۶ امام سفیان ثوری مہدی کے دربار میں گئے تو اس سے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے سفر حج میں صرف بارہ اشرفیاں خرچ کی تھیں، مہدی نے سنا تو اس کو غصہ آگیا اور گرم ہو کر بولا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہاری سی حالت میں ہو جاؤں، سفیان نے نہایت بے باکی سے کہا کہ اگر میری سی حالت میں ہونا گوارا نہ ہو تو جس حالت میں تم ہو اس میں بھی نہ ہونا چاہیے۔[۲]

۷ خلفیہ منصور حج کو چلا تو سولی دینے والوں کو حکم دے دیا کہ سفیان جہاں مل جائیں ان کو وار پر چڑھا دو، لیکن خدا کی شان کہ مکہ پہنچنے سے پہلے ہی منصور کا انتقال ہو گیا، اور سفیان کو سولی دینے کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔[۳]

۸ مہدی اور سفیان کی تیز تیز گفتگو اوپر آپ پڑھ چکے ہیں، آخر آخر میں سفیان اور مہدی کی آپس میں کشیدگی اتنی بڑھ گئی تھی کہ سفیان کو بصرہ میں روپوش ہونا پڑا، اور اسی حالت میں ان کی وفات بھی ہو گئی۔

۹ محدثین میں کتنے حضرات ایسے ہیں جن سے بادشاہوں نے یہ خواہش کی کہ دولت کدہ شاہی پر حاضر ہو کر شاہزادوں کو حدیثیں سنا جائیں، لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا اور نہایت بے پروائی سے ان کی یہ خواہش ٹھکرا دی، بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی حاکم نے کسی محدث کو مسئلہ پوچھنے کے لئے بارگاہ میں بلایا تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ تم خود آؤ، چنانچہ زبان بن عبدالعزیز (مصر کے گورنر لڑکے) نے یزید بن ابی حبیب مصری کے پاس پیادہ بھیج کر کہلایا کہ مجھ کو ایک مسئلہ پوچھنا ہے ذرا دیر کے لئے تشریف لایئے تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ تم خود آکر پوچھ جاؤ تمہارا میرے پاس آنا تمہارے حق میں خوبی و زیبائش ہے، اور میرا آنا تمہارے لئے عیب و بدنمائی

---

[۱] تذکرہ: ١٢٢/١ [۲] تذکرہ: ١٦٢/١ [۳] تہذیب: ص ١١٤

ہے۔[1]

⑮ مہدی جس وقت مدینہ منورہ میں حاضر ہوا تو اس نے امام مالک کے پاس دو یا تین ہزار اشرفیاں بھجوائیں، جب مہدی مدینہ سے رخصت ہونے لگا تو ربیع امام مالک کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المؤمنین چاہتے ہیں کہ آپ بغداد تک ان کے ہمرکاب تشریف لے چلیں امام نے جواب دیا کہ سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مدینہ کے باشندوں کے لئے مدینہ ہی بہتر ہے، اگر وہ سمجھیں اور اگر اشرفیوں کا خیال ہو تو وہ اب تک جیسی کی تیسی رکھی ہوئی ہیں۔[2]

⑪ مہدی کا بیٹا خلیفہ ہارون رشید خود امام مالک کے گھر پر حاضر ہوا شاہزادے بھی ساتھ تھے، امام سے درخواست کی کہ میرے لڑکوں کو اپنی کتاب موطا اپنی زبان سے سنا دیجئے، امام نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں نے ایک مدت سے کسی کو پڑھ کر نہیں سنایا ہے، لوگ خود پڑھ کر مجھے سناتے ہیں، ہارون نے کہا اچھا اور لوگوں کو ہٹا کر تخلیہ کرا دیجئے تو میں خود پڑھ کر آپ کو سناؤں، امام نے فرمایا کہ جب کسی خاص شخص کی وجہ سے عام لوگوں کو علم سے محروم رکھا جاتا ہے تو خاص کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچتا، اس کے بعد امام نے معن بن عیسیٰ کو حکم دیا کہ تم پڑھو اور بادشاہ مع شاہزادوں کے سنے۔[3]

⑫ ہارون الرشید بغداد سے حج کے لئے روانہ ہوا تو کوفہ میں پہنچ کر عبداللہ ابن ادریس اور عیسیٰ بن یونس کے پاس آدمی بھیجے کہ ہمارے پاس آکر حدیثیں بیان کر جائیے دونوں نے آنے سے انکار کر دیا، مجبوراً امین و مامون دونوں شہزادے ابن ادریس کے پاس خود گئے اور ان سے حدیث بیان کرنے کی درخواست کی، ابن ادریس نے قبول فرما لیا، اور سو حدیثیں ان کو سنائیں، جب بیان کر چکے تو مامون نے عرض کیا کہ چچا! اجازت ہو تو میں اپنی یاد سے آپ کے سامنے ابھی ان حدیثوں کو

---

[1] تذکرہ: ۱/۱۲۲ [2] تذکرہ: ۱/۱۹۶ [3] تذکرہ: ۱/۱۹۷

دہرادوں، ابن ادریس نے اجازت دی اور مامون نے سب حدیثیں سنا دیں، ابن ادریس کو مامون کے حافظہ پر بڑا تعجب ہوا، یہاں سے اٹھ کر دونوں شاہزادے عیسیٰ بن یونس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیث سنانے کی درخواست کی، انہوں نے بھی منظور کر لیا، اور حدیثیں سنائیں اس کے بعد مامون نے دس ہزار اشرفیاں (یا درم) نذرانہ کے طور پر پیش کئے مگر ابن یونس نے قبول نہ کیا، اور فرمایا کہ ایک چلو پانی تک تو تمہارا پی ہی نہیں سکتا۔[1]

⑬ محدثین کو بادشاہوں کے تقرب سے اتنی نفرت تھی کہ ابن ادریس کے نام ہارون الرشید کا ایک فرمان آیا، ابھی اتنا ہی پڑھایا گیا تھا کہ خدا کے بندہ ہارون کی طرف سے عبداللہ بن ادریس کے نام کہ ابن ادریس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے اور ظہر کے بعد سے مغرب تک بے ہوش رہے، مغرب سے ذرا پہلے پانی کا چھینٹا دیا گیا تو ہوش آیا، ہوش میں آنے کے بعد فرمایا کہ ''اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ'' ہارون بھی مجھے جاننے لگا، خدا جانے مجھ سے کون سا گناہ صادر ہوا کہ اس نے میرے پاس خط لکھا۔[2]

⑭ وکیع کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ہارون کا ارادہ ہوا کہ ابن ادریس کو قاضی مقرر کرے مگر انہوں نے سختی سے انکار کر دیا، ہارون نے ان کو بلا کر اس کے لئے ان سے گفتگو کی تو انہوں نے کہہ دیا کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں، ہارون نے خفا ہو کر کہا کہ میں تمہاری صورت نہ دیکھے ہوتا تو اچھا تھا، ابن ادریس نے کہا کہ میری بھی یہی تمنا تھی کہ تمہاری صورت نہ دیکھتا یہ کہہ کر چلے آئے۔[3]

ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی

مئو ۱۳۶۰ھ

◆

---

[1] تذکرہ: ۲۵۹/۱ [2] تذکرہ: ۲۶۱/۱ [3] تذکرہ: ۲۶۱/۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ صْطَفٰی

تمہید

مجھے اپنے ایک فاضل دوست کے توسط سے منکرین حدیث کے ایک رسالہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا عنوان ہے، ''میں منکر حدیث کیوں ہوا'' اس رسالہ میں کسی ''حق گو'' صاحب نے انکار حدیث کے وجوہ بیان فرمائے ہیں، اور رواۃ حدیث و مصنّفین کتب حدیث پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بہت زیادہ غلط بیانی سے کام لیا ہے، اور نہایت نامعقول اور گمراہ کن طریقہ سے عوام کو حدیثوں سے بدظن کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ رسالۂ مذکورہ پر ایک تبصرہ لکھ کر ''حق گو'' صاحب کی غلط بیانیوں اور فریب کاریوں کا پردہ چاک کر دیا جاتا، میں خدائے علیم و قدیر کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اپنے اس ناتواں بندہ کو اس خدمت کی توفیق بخشی ''فتقبلها اللّٰه منی کما وفقنی لها.''

''حق گو'' کے رسالہ پر اجمالی تبصرہ

میں سمجھتا ہوں کہ رسالہ مذکورہ پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے پہلے حدیث کی حیثیت اور اس کی حجیت پر قرآن کریم سے روشنی ڈال دی جائے، تو رسالہ مذکورہ اور منکرین حدیث کے دوسرے تمام رسائل پر ایک اجمالی تبصرہ اور ان کا اصولی رو ہو جائے گا، اس لئے پہلے اسی چیز کو پیش کرتا ہوں۔

قرآن کریم اور حدیث

قرآن کریم دنیا میں خدا کی آخری کتاب ہے اور تمام مسلمانوں کا ایمان ہے

کہ یہ کتاب آسمانی دوسری تمام الہامی کتابوں سے بہت زیادہ جامع مکمل اور مفصل ہے اس میں عبادات واخلاق، معاشرت ومعاملات، سیاست واقتصاد معاش ومعاد ہر چیز کا بیان ہے لیکن یہ بھی بالکل بدیہی ہے، کہ امور متذکرہ بالا کا بیان قرآن کریم میں کلی اور اصولی طور پر ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے اس لئے کہ اولاً تو امور مذکورہ کی جملہ جزئیات کا فرداً فرداً تفصیلی بیان قرآن کریم کے برابر محدود ومتناہی کتاب میں ممکن ہی نہیں، ثانیاً ایسے تفصیلی بیان کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے، ہر آدمی جس کو علم سے کچھ تعلق ہے یہ جانتا ہے کہ دنیا کے جملہ علوم وفنون کی کتابوں میں صرف اصولی مسائل اور قوانین کلیہ اور قواعد وضوابط کے بیان پر اکتفاء کیا جاتا ہے، اور مصنّفین کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ طالب علم استاد کی مدد سے ان کلیات کا علم اس طرح حاصل کرے کہ جزئیات کے احکام وحالات انہی کلیات سے معلوم کر سکے۔

رسول اللہ ﷺ معلم قرآن تھے

ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ اللہ ربّ العزت نے دنیا کی ہدایت کے لئے قرآن کریم کو اکیلا نہیں بھیجا تھا اور قرآن کے ذریعہ سے اصلاح وہدایت کی یہ شکل اختیار نہیں کی تھی کہ اس کو کتابی شکل میں بھیج کر لوگوں سے کہہ دیا ہو کہ اس کتاب کو ہر شخص بطور خود پڑھ پڑھ کر اس پر عمل پیرا ہو جائے، بلکہ قرآن سے پہلے اپنے ایک برگزیدہ رسول (ﷺ) کو بھیج کر انہی کے سینہ معارف گنجینہ میں قرآن نازل کیا اور آپ کو مکلّف فرمایا کہ ① آپ لوگوں کو قرآن کی آیتیں پڑھ کر سنائیں ② اور اس کتاب کا درس وتعلیم بھی دیں، اور اس کے رموز واسرار لوگوں پر کھول دیں، قرآن کریم نے کئی مقامات میں اس کی تصریح کی ہے۔

❶ ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ

تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۝﴾ [۱]

ترجمہ: ”جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے کہ پڑھتا ہے تم پر ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب وحکمت اور سکھاتا ہے تم کو وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔“

❷ ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ [۲]

ترجمہ: ”بہ تحقیق احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں پر جب کہ بھیجا ان میں ایک رسول انہی میں سے کہ تلاوت کرتا ہے ان پر ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے ان کو اور تعلیم کرتا ہے ان کو کتاب وحکمت کی بالیقین تھے وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں۔“

❸ ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ [۳]

ترجمہ: ”(وہی) وہ ذات ہے جس نے بھیجا ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں سے کہ تلاوت کرتا ہے ان پر ہماری آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی ان کو تعلیم دیتا ہے بالیقین وہ تھے اس سے پہلے کھلی گمراہی میں۔“

ان آیات میں بکرات ومرات تصریح کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیتیں لوگوں کو سنا دیتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ کتاب وحکمت کی تعلیم اور درس قرآن بھی ان کے فرائض رسالت میں سے

---

[۱] بقرہ پارہ ۳ [۲] ال عمران پارہ ٤ [۳] جمعہ پارہ ۲۸

ایک اہم فریضہ ہے، درحقیقت ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے کہ ہم نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور انہوں نے عرب میں جیسا رسول بھیجنے کی درخواست کی تھی بعینہٖ انہی اوصاف کا جامع اور انہی خصوصیات کا حامل رسول ہم نے ان میں مبعوث کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا خود قرآن مجید میں بایں الفاظ منقول ہے۔

﴿رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝﴾[1]

ترجمہ: ''اے ہمارے مالک! اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں سے کہ تلاوت کرے ان پر تیری آیتیں اور سکھائے ان کو کتاب وحکمت اور پاک کرے ان کو بے شک تو ہی غالب (اور) حکمت والا ہے۔''

تعلیم کتاب کا مطلب

اب غور طلب امر یہ ہے کہ تلاوت آیات کے بعد تعلیم کتاب وحکمت سے کیا مراد ہے؟ آیا کتاب اللہ کا لفظی ترجمہ اور لغوی مفہوم بتانا یا اس کے معانی ومطالب اسرار وحکم اور وہ فروع وجزئیات جو اس سے مستنبط ہوتے ہیں ان سے لوگوں کو آشنا کرنا ظاہر ہے کہ پہلی صورت تو قطعاً مراد نہیں ہے اس لئے کہ عرب جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے اور جو عہد نبوی میں قرآن کے مخاطب اول تھے وہ اس تعلیم سے بے نیاز تھے، قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور یہ زبان ان لوگوں کی اپنی مادری زبان تھی، لہٰذا قرآن کا لفظی ترجمہ اور مفہوم لغوی ان کو معلوم کرانا بے ضرورت تھا، پس لامحالہ ماننا پڑے گا کہ تعلیم کی دوسری ہی صورت مراد ہے، چنانچہ قرآن کریم

---

[1] بقرہ پارہ ۱

نے اسی مضمون کو ذیل کی آیتوں میں بیان کیا ہے۔

❶ ﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ﴾ [1]

ترجمہ: ''اور نہیں نازل کی ہم نے کتاب مگر اس لئے کہ آپ بیان کریں ان لوگوں کے لئے۔''

❷ ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ [2]

ترجمہ: ''اور نازل کیا ہم نے آپ کے پاس ذکر (کتاب) کو تا کہ کھول کھول کر بیان کریں لوگوں کے واسطے اس چیز کو جو نازل کی گئی ان کی طرف اور تا کہ وہ غور وفکر کریں۔''

اور اس تعلیم وتبیین کی ضرورت اسی لئے پیش آئی کہ قرآن کریم میں عبادات و معاملات اور اخلاق و معاشرت وغیرہ کے صرف اصول اور کلی قوانین مذکور ہیں اور ان اصول وکلیات سے ان کے فروع وجزئیات کا استنباط واستخراج ہر شخص کے لئے ممکن نہ تھا بلکہ بعض جزئیات تک تو کسی شخص کی بھی رسائی ممکن نہ تھی، بجز اس ذات مقدس کے جس کا سینہ انوار وحی کا مخزن اور جس کا قلب تجلیات ربانی کی منزل ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص فہم قرآن

میرے اس بیان میں اس شخص کو تو کوئی شک نہیں ہوسکتا جس کا دل مرتبہ رسالت کی عظمت وجلالت کے اعتقاد سے لبریز ہے، لیکن جو شخص اس ایمانی کیفیت سے نا آشنا ہو، میں اس سے کہتا ہوں کہ یہ تو بالکل بدیہی ہے کہ قرآن کریم کا کچھ نہ کچھ فہم تو ہر اس شخص کو عطا ہوا ہے جو عربی زبان کا حرف شناس ہے اور یہ بھی بدیہی ہے کہ اس فہم کے مراتب ودرجات متفاوت ومختلف ہیں، رات دن کا مشاہدہ ہے کہ

---

[1] پارہ ۱۴ ع ۱۳ [2] پارہ ۱۴ ع ۱۱

ایک آیت کو ہم بار بار پڑھتے ہیں اور سینکڑوں دفعہ ہماری نظر سے گزرتی ہے اور اس سے کسی خاص نکتہ کی طرف ہمارے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی لیکن ایک دوسرا شخص بیک نظر اس سے کوئی بہت نفیس علمی نکتہ اخذ کر لیتا ہے پس جب ایک امتی کو دوسرے امتی پر فہم قرآنی میں یہ تفوق حاصل ہوسکتا ہے اور حاصل ہے تو کیا خود اس کو جس کے قلب پر قرآن نازل ہوا، اور جس کا سینہ بالقائے ربانی اس وحی آسمانی سے معمور ہوا اس کو سب امتیوں پر فہم قرآن میں کوئی تفوق وامتیاز خاص حاصل نہ ہوگا؟ میں تو یہی کہوں گا کہ کوئی مسلمان اس کا جواب نفی میں دینے کی جرأت نہیں کرسکتا، اور کیسے جرأت کرسکتا ہے جب کہ قرآن کریم خود ہی بتا رہا ہے کہ اس کے معلم ﷺ کو منجانب اللہ فہم قرآن کے بارے میں ایک خاص بصیرت اور سوجھ بوجھ عطا کی گئی تھی جس کی بناء پر آپ کو لوگوں کے درمیان حکم مطلق کی حیثیت نوازش کی گئی تھی خدا فرماتا ہے۔

﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ﴾[1]

ترجمہ: ”بے شک ہم نے نازل کیا آپ پر کتاب کو تاکہ آپ فیصلہ کریں لوگوں کے درمیان اس چیز کے ساتھ کہ اللہ آپ کو دکھائے اور سوجھائے۔“

یہ آیت صراحۃً بتا رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو کتاب اللہ کا خاص فہم اور خاص سوجھ اور سمجھ عطا کی گئی تھی تاکہ آپ اس کے ذریعہ سے قرآنی احکام کے ماتحت لوگوں کے جھگڑے چکائیں اور فیصلے فرمائیں۔

فہم قرآن کے لئے شرح رسول کی روشنی درکار ہے

ان بیانات سے خوب واضح ہوگیا کہ آنحضرت ﷺ قرآن کریم کے معلم اور

---

[1] نساء پ ۵

شارح ومبین تھے اور آپ کی شرح وتبیین اور تعلیم اس بصیرت کی روشنی میں ہوتی تھی جو خاص آپ کو منجانب اللہ عطا ہوئی تھی اور چونکہ۔

ع ایں دولت و سرمد ہمہ کس راند ہند

یعنی یہ بصیرت خاصہ آپ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے اس لئے ہر امتی کو قرآن کریم کے باریک معانی دقیق مطالب اور اس کے غوامض ودقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے حضرت شارح قرآن علیہ السلام کی شرح وتبیین کی روشنی درکار ہوگی، چنانچہ خدا نے اس کو بھی قرآن کریم میں بیان کیا۔

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”بہ تحقیق تمہارے پاس اللہ کی جانب سے ایک نور (مجسم) اور ایک روشن کتاب آئی ہے۔“

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے کتاب مبین سے پہلے ایک نور کا ذکر فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب مبین کے معانی ومطالب تک رسائی بدوں اس نور خاص کے ممکن نہیں، اور ہر وہ شخص جو کتاب مبین کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اور اس پر عمل کرنے کا شوق رکھتا ہے، اس کو اس نور کی روشنی میں کتاب اللہ کا مطالعہ کرنا چاہئے، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ نور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس سے عبارت ہے پس ثابت ہوگیا کہ کتاب اللہ کی مراد سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی وعملی شرح سے کوئی مسلمان بے نیاز نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے بغیر یہ دونوں باتیں ممکن ہی نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرحِ قرآن ہی کا نام حدیث وسنت ہے

جب یہ بات بخوبی ذہن نشین ہوگئی کہ قرآن کریم کے معلم وشارح علیہ السلام نے

---

[1] پ ٦ ع ٦

قرآن کریم کی جو شرح وتبیین فرمائی ہے وہ خدا کی دی ہوئی بصیرت اور روشنی میں کی ہے اور صرف یہی نہیں کہ اس شرح سے کوئی مسلمان بے نیاز نہیں ہوسکتا بلکہ اس سے بے نیازی برت کر کوئی مسلمان خود قرآن کریم پر عمل نہیں کرسکتا اور نہ اس کے حقیقی مفہوم ومراد تک رسائی حاصل کرسکتا ہے، تو اب یہ ماننے میں آپ کو کیا تامل ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ اس کی وہ شرح وتبیین بھی جو اس کے شارح ومبین علیہ السلام نے فرمائی ہے، ہر مسلمان کے لئے واجب التسلیم ہے، اور قرآن کے بعد دین متین محمدی اور شریعت اسلامیہ کا وہ ستون ہے جس پر یہ سر بفلک عمارت قائم ہے۔

قرآن کریم کی اسی شرح وتبیین اور قولی وعملی بیان کا نام حدیث وسنت ہے، اگرچہ مذکورہ بالا بیان کے بعد کسی طالب حق کو حدیث وسنت کے واجب التسلیم ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی تاہم مزید اطمینان کے لئے اس مسئلہ پر قرآن کریم ہی سے مزید روشنی ڈالی جاتی ہے۔

حجیت حدیث کے اور دلائل

قرآن کریم کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق او آپ کی نبوت پر ایمان لانے کی پر زور دعوت دی ہے اسی طرح ایک اور بات کا بھی نہایت موکد حکم دیا ہے اور اس کو کہیں ”اطاعت رسول“ کے عنوان سے ذکر کیا ہے اور کہیں اس کی تعبیر رسول کو ”حکم مطلق“ ماننے سے کی ہے پہلے مضمون کے لئے حسب ذیل آیتوں کو غور سے پڑھنا چاہئے۔

❶ ﴿يَٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ

بَعِيْدًا ۝﴾[1]

ترجمہ: ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری، اور جو انکار کرے گا اللہ کا اور ملائکہ کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور پچھلے دن کا تو وہ دور کی گمراہی میں پڑ گیا۔''

❷ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ﴾[2]

ترجمہ: ''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر اور ان میں کوئی تفریق نہ کی وہ لوگ ہیں کہ عنقریب اللہ ان کو ان کے اجر دے گا۔''

❸ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ﴾[3]

ترجمہ: ''اے لوگو! بے شک تمہارے پاس حق کے ساتھ رسول آیا پس ایمان لاؤ اسی میں تمہارے لئے بھلائی ہے۔''

❹ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾[4]

ترجمہ: ''مومن بس وہی ہیں جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور اس کے رسول پر۔''

❺ ﴿وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ۝﴾[5]

ترجمہ: ''اور جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے تو ہم نے

---

[1] پ ۵ ع ۱٦ [2] پ ٦ ع ۱ [3] پ ٦ ع ۳

[4] پ ۲٦ ع ۱۳ [5] پ ۲٦ ع ۹

منکروں کے لئے دہکتی ہوئی آگ تیار کی ہے۔"

اور دوسرے مضمون کے لئے آیات ذیل سامنے رکھنی چاہئیں۔

① ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝﴾[1]

تَرجَمہ: "اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔"

② ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾[2]

تَرجَمہ: "اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اگر تم ایمان والے ہو۔"

③ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝﴾[3]

تَرجَمہ: "اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور منہ نہ پھیرو اس سے دران حالیکہ تم سنتے ہو۔"

④ ﴿وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾[4]

تَرجَمہ: "اور وہ مومن اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔"

⑤ ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا﴾[5]

تَرجَمہ: "اور فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی اور ڈرو اس کی مخالفت سے۔"

⑥ ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾[6]

تَرجَمہ: "جس نے حکم مانا رسول کا تو شبہ نہیں کہ اس نے اللہ کا حکم مانا۔"

---

[1] پ ٢٦ ع ٧
[2] پ ٩ ع ١٥
[3] پ ٩ ع ١٦
[4] پ ١ ع ١٤
[5] پ، ع ٢
[6] پ ٥ ع ٧

۷ ﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝﴾[1]

ترجمہ: ”اور جب کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کی طرف جس کو خدا نے نازل کیا اور (آؤ) رسول کی طرف تو دیکھو گے (اے رسول) منافقوں کو کہ منہ پھیرتے ہیں تم سے منہ پھیرنا۔“

۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾[2]

ترجمہ: ”اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اپنے میں سے امر والوں کا پس اگر جھگڑو تم کسی بات میں، تو لوٹاؤ اس کو اللہ اور رسول کی طرف۔“

۹ ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝﴾[3]

ترجمہ: ”پس قسم ہے آپ کے پروردگار کی کہ وہ مؤمن نہیں ہو سکے تاوقتیکہ (اے رسول ﷺ) ان کے آپس میں جو نزاع واقع ہو، اس میں آپ کو حکم نہ بنائیں، پھر نہ پائیں اپنے دلوں میں کوئی تنگی تمہارے فیصلہ سے اور پورا پورا تسلیم کر لیں۔“

۱۰ ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝﴾[4]

---

[1] پ ۵ ع ۵
[2] پ ۵ ع ۵
[3] پ ۵ ع ٦
[4] پ ۲۳ ع ۱

تَرجَمۂ: ”کسی ایمان والے مرد یا عورت کو حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کوئی حکم دے دیں تو ان کو اپنے معاملہ کا اختیار باقی رہے، اور جو نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی تو وہ بے شبہ کھلا گمراہ ہو گیا۔“

دونوں قسم کی آیتیں آپ کے سامنے ہیں، پہلی قسم کی آیتوں میں جس طرح خدا، ملائکہ، کتاب اللہ اور قیامت پر ایمان لانے کا حکم ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی تاکید ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اعتقاد اور آپ کے مبعوث من جانب اللہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے، اور دوسری قسم میں اس کے سوا ایک دوسری بات کا حکم ہے اور وہ یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کو تسلیم کرنا ضروری ہے، اسی طرح رسول کی فرمانبرداری اور آپ کے احکام کی تعمیل بھی ضروری ہے یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کتاب اللہ میں مذکور ہیں، لہٰذا اس کی اطاعت و فرمانبرداری سے مراد یہ ہے کہ اس کی کتاب کو دستور العمل بنایا جائے لیکن غور طلب یہ چیز ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری اور اس کے احکام کی تعمیل سے کیا مراد ہے، اگر کہیے کہ وہی کتاب اللہ کی پیروی تو میں کہوں گا کہ یہ بات تو پہلے فقرہ میں آچکی ہے، لہٰذا ایک ہی بات کو دو عنوانوں سے ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر یہ ایک جگہ نہیں، بلکہ مذکورہ بالا سب آیتوں میں اور ان کے سوا دوسری صدہا آیتوں میں بھی یونہی ہے، تو کیا ہر جگہ یہی کہہ دیا جائے گا کہ دوسرے فقرے میں بھی پہلی ہی بات دہرادی گئی ہے قرآن کریم کے معجزانہ ایجاز کو پیش نظر رکھتے ہوئے تو کوئی صاحب عقل یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اور اگر یہ تاویل بارد ”اطیعوا اللّٰہ ورسولہ“ یا اس قسم کی دوسری آیتوں میں چل بھی جائے تو آیت نمبر ۹ میں کیا تاویل کی جائے گی؟ اس میں تو اطیعوا

اللّٰہ کا فقرہ موجود ہی نہیں بلکہ اس میں تو اتنا مذکور ہے کہ کوئی اس وقت تک مؤمن ہی نہیں ہوسکتا جب تک اپنی جملہ تراعات اور اپنے تمام اختلافات میں نبی عربی ﷺ کو ایسا حکم اور فیصلہ کن نہ قرار دے کہ آپ کے فیصلہ سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کرے بتایئے کیا یہاں بھی یہی کہے گا کہ آنحضرت ﷺ کو حکم ماننے سے مراد کتاب اللہ کو حکم ماننا ہے؟

اگر کوئی صاحب یہ جرأت کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو بتائیں کہ اس کے لئے ان کے پاس کون سی دلیل ہے؟ پھر یہ بھی بتائیں کہ اگر یہی مراد تھی تو یحکموک کی بجائے یحکموا کتاب اللہ کہنے میں کیا نقصان تھا؟

بہرحال آیات مذکورۃ الصدر سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی فرمانبرداری اور کتاب اللہ کی پیروی کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری اور احکام رسول (ﷺ) کی تعمیل بھی ضروری ہے اور یہ کہ رسول اللہ (ﷺ) کو اپنے ہر اختلاف میں حکم مطلق ماننا مدار ایمان ہے، اور ہم احکام رسول (ﷺ) اور آپ کے فیصلوں ہی کو ''حدیث'' کہتے ہیں پس حدیث رسول ﷺ کے واجب التسلیم ہونے میں اب کون سا شبہ باقی رہ گیا۔

کیا آنحضرت ﷺ کے بست و سہ سالہ عہد رسالت میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف واقع نہیں ہوا، کیا اس طویل مدت میں آپ کے روبرو کوئی مقدمہ پیش نہیں ہوا، اگر ہوا (اور بہت ہوا) تو بتایا جائے کہ ان اختلافات و مقدمات میں جو فیصلے دربار رسالت سے صادر ہوئے ان کا کیا نام ہے، اور وہ کہاں ہیں؟

اگر کوئی بدبخت یہ کہے کہ وہ سارے فیصلے مسلمانوں کی بے اعتنائی سے نذر حوادث ہوگئے اور آنحضرت ﷺ کا ایک فیصلہ بھی دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا تو یہ اسلام کی تاریخ پر نہایت ناپاک حملہ ہے، اور ایسا شخص مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے۔

رسول علیہ السلام کی حرام کی ہوئی اشیاء بھی اسی طرح حرام ہیں جس طرح خدا کی حرام کی ہوئی

اس کے بعد قرآن کریم کی ایک اور آیت کی طرف بھی میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ میں جو چیزیں حرام کی ہیں ان کے علاوہ اور کچھ چیزیں بھی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے اور ان چیزوں کو حرام سمجھنا اور ان کے استعمال سے بچنا اسی طرح ضروری اور واجب ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی اشیا سے، ارشاد ہوتا ہے۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾[1]

ترجمہ: ”لڑو ان لوگوں سے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور جن چیزں کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے، حرام نہیں قرار دیتے۔“

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرام کی ہوئی چیزیں کون کون سی ہیں اور ان کے معلوم کرنے کے ذرائع کیا ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ چیزیں بجز اس چیز کے جس کو ہم ”حدیث“ کہتے ہیں اور کہیں سے معلوم نہیں ہو سکتیں، پس معلوم ہوا کہ احادیث میں جن اشیاء کی حرمت مذکور ہے ان کو حرام نہ سمجھنا بلکہ پورے ذخیرہ احادیث کو بے کار موضوع اور بناوٹی کہنا درحقیقت اس آیت اور آیات سابقہ کا انکار کر دینا ہے۔

اس مقام پر میں ابوداؤد و ابن ماجہ کی ایک حدیث نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس کو اس آیت کی شرح کہنا بے جا نہ ہوگا، اس حدیث کے پڑھنے کے بعد علماء

---

[1] پ ۱۰ ع ۱۰

محققین کی اس تحقیق کی صداقت آئینہ ہو جائے گی کہ احادیث نبویہ درحقیقت قرآن کریم کی شرحیں ہیں اور اس سے ماخوذ و مستنبط ہیں وہ حدیث یہ ہے۔

”یوشك الرجل متکئا علی اریکته یحدث بحدیث من حدیثی فیقول بیننا وبینکم کتاب اللّٰه فما وجدنا فیه من حلال استحللناه وما وجدنا فیه من حرام حرمناه الا وان ما حرم رسول اللّٰه مثل ما حرم اللّٰه.“

ترجمہ: ”وہ زمانہ قریب ہے جب کہ ایک آدمی اپنے تخت پر بیٹھا ہوگا، اور اس سے میری کوئی حدیث بیان کی جائے گی، تو وہ کہے گا کہ ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ موجود ہے اس میں جو حلال ہو ہم اس کو حلال سمجھیں گے اور جو حرام ہو اس کو حرام لیکن تم آگاہ رہو کہ جن اشیا کو رسول اللہ ﷺ نے حرام کیا وہ بھی انہی کی طرح ہیں جن کو اللہ نے حرام کیا“۔

آنحضرت ﷺ کی تحلیل وتحریم کا ذکر قرآن کی دوسری آیت میں

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں آنحضرت ﷺ کی تحلیل وتحریم دونوں کا ذکر موجود ہے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں امور میں آپ کے اتباع کی دعوت کے علاوہ اس ذکر کا کوئی مقصود نہیں ہو سکتا، ارشاد ہے۔

﴿ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم.﴾[1]

ترجمہ: ”اور رسول (ﷺ) امی لوگوں کے لئے پاکیزہ اشیاء کو حلال اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں اور ان سے اس بوجھ اور ان

---

[1] پ ۹ ع ۹

پھانسیوں کو جوان پر پہلے تھیں اتارتے ہیں۔“

آنحضرت ﷺ کے افعال کی پیروی کا حکم بھی قرآن نے دیا ہے

اقوال تو اقوال قرآن کریم نے آنحضرت ﷺ کی ایک ایک ادا کی پیروی کرنے کی بھی دعوت دی ہے، ارشاد ہوا ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.“ (یعنی) تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات مقدس میں بہتر پیروی کی باتیں ہیں، آنحضرت ﷺ کے انہی اعمال اور افعال کو جن کی پیروی کا حکم آیات بالا میں ہے، ”ہم سنت“ کہتے ہیں، اس پورے بیان کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کے علاوہ آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال بھی قابل عمل واجب التسلیم اور حجت ہیں اس مضمون کو خود قرآن کریم نے مختلف عنوانوں سے بیان کیا ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے تمام مسلمانوں کا یہی عقیدہ یہی خیال اور بالاتفاق سب کا اسی پر عمل تھا اور ہے۔

انکار حدیث

لیکن چند دنوں سے ہندوستان میں کچھ افراد ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو مسلمانوں کے اس قدیم اجماعی عقیدے کو غلط اور افعال و اقوال نبوی ﷺ کی پابندی کو غیر ضروری بتاتے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان عملی ذخیروں کو جو اقوال و افعال نبوی پر حاوی ہیں، مفتریات کی پوٹ اور مصنوعی و خود تراشیدہ افسانوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، اور بالکل صاف صاف یہ کہ احادیث نبویہ کے قابل عمل و لائق اعتبار ہونے سے انکار کرتے ہیں، جہاں تک غور کیا گیا، لامذہبیت کے سوا اور کوئی علت انکار حدیث کی معلوم نہیں ہوتی، اس کا راز صرف یہ ہے کہ انکار حدیث کے بعد ان کی ملحدانہ تگ و دو کے لئے میدان نہایت وسیع اور ہموار ہو جائے گا، مذہبی پابندیاں یکسر

نیست و نابود ہو جائیں گی، یا بدرجہ اقل صرف نام کو رہ جائیں گی، ایک قرآن رہ جائے گا، اس کے معنی و مفہوم میں اپنی رائے و قیاس سے جو تصرف و تحریف کرنا چاہیں گے، پوری آزادی سے کرسکیں گے، اگر کسی نے ٹوکا کہ یہ مفہوم احادیث یا تفاسیر کے خلاف ہے تو نہایت صفائی سے کہہ دیا جائے گا، کہ وہ مفہوم اگر راوی اور مفسر نے اپنی سمجھ سے بیان کیا ہے، تو ہم اس کے پابند نہیں ہیں، اور اگر حدیث نبوی کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے تو حدیث قابل اعتبار و استناد نہیں ہے، چلئے قصہ ختم ہوا، اب جس آیت کا جو مفہوم چاہئے قرار دے لیجئے، کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا، یہ خیالات نہیں ہیں بلکہ واقعات ہیں، منکرین حدیث کے جس مضمون یا رسالہ میں چاہیں اس کی مثالیں مل سکتی ہیں، ایسی بعض مثالیں میں آگے ذکر بھی کروں گا؟

میں نے منکرین حدیث کے انکار کی جو علت ذکر کی ہے حقیقی علت تو وہی ہے لیکن اس علت کے اظہار کے بعد کون بے خرد مسلمان ہوگا، جو ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی خرافات کو سن سکے اور ان کے دام فریب میں آسکے، اس لئے اس پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسری دوراز کار علّتیں تراشی جاتی ہیں اور اگرچہ ان علّتوں کی سخافت و کمزوری بھی بہت کھلی ہوئی ہے تاہم بعض ناواقف مسلمان منکرین حدیث کے ملمع کارانہ بیان سے دھوکہ میں آجاتے ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مختصر طور پر کچھ ان کی نسبت بھی لکھ دوں۔

منکرین حدیث کے وسوسوں کا دفعیہ

انکار حدیث کی جو علّتیں ذکر کی جاتی ہیں، یا کی جاسکتی ہیں، ان کو علت کہنا علت کی توہین ہے، اس لئے میں بجائے علت کہنے کے وسوسہ سے تعبیر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ حسب ذیل وسوسے انکار حدیث کے باعث بن سکتے ہیں۔

پہلا وسوسہ: اقوال وافعال نبوی (ﷺ) کی پیروی کا خدا نے حکم ہی نہیں دیا اس کا تفصیلی رد آپ سن چکے اور معلوم کر چکے کہ اقوال وافعال نبوی ﷺ کے واجب التسلیم قابل پیروی ہونے کا منکر قرآن کی صدہا آیات کا منکر ہے۔

دوسرا وسوسہ: اقوال وافعال نبوی ﷺ قابل پیروی تو ہیں لیکن ان کا کہیں وجود نہیں ہے مسلمانوں کی بے اعتنائی سے ایک قول یا ایک فعل کی نقل وحکایت بھی محفوظ نہ رہی مسلمانوں نے اس کی نقل وحکایت کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔

اس کا جواب: یہ ہے کہ ایسی بدیہی ومتواتر بات کا انکار جس کا اعتراف غیر مسلموں کو بھی ہے، محل تعجب ہے یہ بات تواتر کے اعلیٰ درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ جو مسلمان آنحضرت ﷺ کی صحبت سے شرف اندوز ہوئے انہوں نے آپ کے جملہ اقوال وافعال کی حفاظت کا ایسا اہتمام کیا جس کی نظیر کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی، زبانی یادداشت کے علاوہ تحریری یادداشت کا بھی انتظام کیا، جیسا کہ مقدمہ میں پورے شرح وبسط کے ساتھ بتایا جا چکا ہے پھر اس امانت کو پورے احتیاط کے ساتھ انہوں نے تابعین کے حوالہ کیا اور تابعین نے اس کو تبع تابعین تک پہنچایا، اس عہد میں زبانی روایات کا سلسلہ تو جاری ہی رہا تصنیف وتالیف بھی شروع ہوگئی چنانچہ اس عہد کا ایک مجموعۂ اقوال وافعال نبوی آج بھی دنیا کے ہر گوشہ میں مؤطا کے نام سے موجود ہے اور اس کے بعد تو بکثرت ایسے مجموعے تیار ہوئے جس کو مسلمانوں نے اصولی طور پر بلا رد وقدح قبول کیا، اور آج تک برابر قبول کرتے آئے چنانچہ یہ مجموعے آج بھی نہایت کثیر تعداد میں موجود ہیں تو کیا ان کے وجود سے انکار کر دینا آفتاب کے وجود سے انکار کے مرادف نہیں ہے؟

غیر مسلموں کی شہادتیں

میں نہیں سمجھتا کہ یہ منکرین ایسی متواتر چیز کا کس طرح انکار کر سکتے ہیں جس کا

اعتراف متعصب یوروپین مصنّفین کو بھی ہے، حالانکہ منکرین ان کی کسی بات کو وحی سے کم تصور نہیں کرتے منکرین کو سوچنا چاہئے کہ صرف مسلمان ہی اس کے قائل نہیں ہیں کہ اقوال و افعال نبوی ﷺ محفوظ ہیں، بلکہ غیر مسلم مورخین بھی اس کے مقر و معترف ہیں، چنانچہ مشہور روسی فیلسوف ٹاٹسائی نے آنحضرت ﷺ کے چند حکیمانہ اقوال زریں کا ترجمہ روسی زبان میں شائع کیا ہے اور مشہور مورخ ایڈورڈ گبن نے تاریخ زوال روم (جلد۵ باب ۵۰) میں لکھا ہے ”ہر ایک بانی مذہب کی سیرت سے اس کے تحریری مکاشفات کی تکمیل ہوتی ہے، چنانچہ (حضرت) ﷺ کی حدیثیں امر حق کی جامع نصیحتیں اور ان کے افعال مجسم نیکی کے نمونے ہیں“ اگر اقوال و افعال نبویہ ”علی صاحبها الصلوة والتحية“ کا کوئی ذریعہ علم دنیا میں موجود نہیں تو ٹاٹسائی کس کے اقوال کا ترجمہ شائع کرتا ہے، اور گبن کس کے اقوال و افعال کو جامع نصیحت اور مجسم نیکی کا نمونہ بتا رہا ہے۔

مسلمانوں کا ناز خاک میں مل جائے گا

مسلمانوں کو تمام دنیا کے مقابلہ میں ناز اور بجا ناز تھا کہ اسلام کی تاریخ سے زیادہ مکمل تاریخ کسی مذہب کی نہیں ہے اور داعی اسلام کے حالات زندگی ان کے افعال و اقوال وغیرہ جتنی تفصیل و تکمیل کے ساتھ مسلمان پیش کر سکتے ہیں، دنیا کا کوئی دوسرا مذہب اپنے داعی کی نسبت اس کا ہزارواں حصہ بھی پیش کرنے سے عاجز ہے مسلمانوں کے پاس ان کے رسول ﷺ کی زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ اور جزئی سے جزئی حالت کی نہایت مستند نقل موجود ہے مسلمانوں کے پاس ان کے نبی ﷺ کی خوراک و پوشاک نشست و برخاست نقل و حرکت غرض ہر چیز کا بیان موجود ہے، لیکن منکرین حدیث نے حدیث کا انکار کر کے مسلمانوں کا یہ فخر و ناز بھی خاک میں ملا دیا۔

مولانا سیّد سلیمان صاحب ندوی نے اگست ۲۹ء کے معارف میں بہت خوب لکھا ہے کہ۔

’’اسلام کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے رسول ﷺ کے ایک ایک واقعہ ایک ایک قول اور ایک ایک حکم کو دنیا میں محفوظ رکھا اور ان کے لئے متعدد اصول اور فن ایجاد کئے، مگر اگر اسلام کے ان نئے محسنوں (یعنی منکرین حدیث) کے خیالات مان لئے جائیں تو یہ کارنامہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے لعنت بن جائے گا، اور صحابہ سے لے کر آج تک وہ تمام اخیار و اکابر امت جن کی زندگیوں پر آج نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کو ناز ہے وہ سب کے سب راست بازی اور صداقت کی بارگاہ سے راندہ نکلیں گے، کیا یہ اسلام پر احسان ہے؟ آنحضرت ﷺ کے بعد سے لے کر آج تک خلفائے راشدین تابعین ائمہ مجتہدین علمائے خیر تمام کے تمام اپنے استنباطات اور اجتہادات میں قرآن پاک کے بعد احادیث اور اقوال نبوی کی تقلید و اتباع کرتے رہے ہیں، لیکن آج سے یہ لازم آئے گا کہ یہ سب کے سب نعوذ باللہ مشرک انسان پرست اور کتاب اللہ کے تارک تھے، اور آج جو نئے مفسر اور نئے فقیہ بنے ہیں ان کے اقوال و اجتہادات و استنباطات کے سننے والے سچے موحد سچے دیندار اور کتاب اللہ کے سچے پیروکار ثابت ہوں اس کے بعد یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ کا مشن سخت ناکام رہا اور تیرہ سو برس تک اسی طرح ناکام رہا، یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک قطعہ میں کتاب اللہ کے چند ماہرین اسرار پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے اصل اسلام کو دنیا میں آشکارا کیا اور وہ کام کیا، جو نہ خود رسول اللہ (ﷺ) نے نہ ابوبکر صدیق ؓ نے کیا، نہ عمر فاروق ؓ نے کیا نہ علی مرتضی ؓ

نے کیا، نہ دوسرے صحابہ اور تابعین نے کیا اور نہ دوسرے ائمہ مجتہدین سے ہوسکا، پھر ہمیں کوئی بتائے کہ قرآن کی عملی تصویر دنیا میں کبھی جلوہ گر تھی یا نہیں، اگر تھی تو وہ کب؟ اور اس کی تاریخ کہاں ملے گی؟ اور اگر نہ تھی تو قرآن سے زیادہ ناکام صحیفہ آسمانی دنیا میں اور کون ہوگا، کیا کسی مسلمان کی غیرت اسلامی اس خیال کو جائز رکھتی ہے۔''

مسلمانانِ سلف پر سخت حملہ

اگر احادیث کا یہ سارا ذخیرہ بے اعتبار مصنوعی اور بناوٹی ہے تو میں منکرین حدیث سے پوچھتا ہوں کہ کیا جس وقت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مثلاً مؤطا میں بزعم منکرین حدیث رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء پردازیاں کیں، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم و اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کی طرف جھوٹی جھوٹی باتیں منسوب کیں، اسلام کے عین مرکز میں اور اس سرزمین میں جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں اور وہاں بھی خاص اس مسجد محترم میں جو دس برس تک درس گاہ نبوت اور سجدہ گاہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) رہ چکی تھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان مفتریات واکاذیب کا مجموعہ درس دینا شروع کیا، اور اس درس میں اندلس، مصر، شام، کوفہ، بصرہ اور بلاد عجم تک کے علماء شریک ہوئے اور اس مجموعہ کی روایت وسماع بلکہ ان کی نقلیں حاصل کر کے اطراف عالم میں پھیل گئے اور اس مجموعہ کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا، تو اس وقت کوئی ہمدرد اسلام کوئی حقیقی مسلمان بلکہ کوئی غیرت مند انسان ایسا نہ تھا جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی اس نازیبا کاروائی کے خلاف لب کشائی کرنے کی جرأت کرتا، اور مسلمانوں کو ان کے فریب سے بچاتا، اور ان افتراء پردازیوں کی روک تھام کرتا، درصورتیکہ یہ روک تھام اور افتراء پردازیوں کی پردہ دری کچھ مشکل بھی نہ تھی، اس لئے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں جو روایتیں جمع کی ہیں ان کی نسبت یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ انہوں نے ان کو فلاں

فلاں علماء سے سنا ہے اور تصنیف مؤطا کے وقت ان میں سے بہت سے علماء بقید حیات موجود تھے لہٰذا امام مالک کے خلاف ان علماء کی شہادتیں حاصل کر کے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی غلط بیانیوں کا راز نہایت آسانی سے فاش کیا جا سکتا تھا لیکن کسی نے ایسا نہ کیا ایک آواز بھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مخالفت میں نہ اٹھی کسی عالم نے بھی ان کو افتراء پرداز اور غلط گو نہ کہا ممکن ہے منکرین حدیث بول اٹھیں کہ مؤطا کی تصنیف حکومت کی سرپرستی میں ہوئی ہے، اس لئے حکومت کے خوف سے کوئی نہیں بولا لیکن یہ کہنا جہالت کا بدترین نمونہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخیں شاہد ہیں کہ اس زمانہ کے اہلِ علم حکومتوں کے خوف سے حق گوئی سے کبھی باز نہ رہتے تھے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بلکہ خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حکومت نے ان حضرات کے ساتھ انتہائی جبر وتشدد سے کام لیا، مگر ان حضرات نے اپنی تحقیق کے خلاف لب نہ ہلایا مہربانی فرما کر منکرین حدیث علمائے سلف کو اپنے اوپر قیاس نہ کریں۔

علاوہ بریں یہ بالکل تاریخی بات ہے اور تاریخوں میں بہ سرپرستی حکومت مؤطا کے تصنیف ہونے کا کوئی ضعیف سے ضعیف ثبوت بھی نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ تصنیف مؤطا کے بعد بادشاہ وقت نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ آپ شاہی محل میں شاہزادوں کو مؤطا کا درس دے جایا کریں تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ جس کو علم کی طلب ہو، اس کو عالم کی خدمت میں خود حاضر ہونا چاہئے اگر امام مالک نے حکومت کی سرپرستی میں کتاب لکھی ہوتی اور حکومت کی رضا مندی ہی اس تصنیف کی غرض وغایت ہوتی تو خود اپنی عقل سے سوچو کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یہ جواب بادشاہ وقت کو ہرگز نہیں دے سکتے تھے امام مالک سے پہلے حدیث کے جو مجموعے تیار ہوئے مثلاً ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۵۰ھ اور ابن عروبہ رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۵۶ھ اور ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۴ھ نے حدیث کی جو کتابیں لکھی تھیں ان کے لکھنے کے وقت میں بھی کسی مسلمان نے ان کی کاروائیوں

پر اظہار نفرت نہ کیا نہ کسی نے ان کی مخالفت کی حالانکہ ان کے وقت میں تو خود صحابہ کرام بھی موجود تھے لیکن کیا منکرین حدیث کسی تاریخ سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ کسی صحابی نے ان کی تکذیب کی ان کو مفتری کہا اور ان کی غلط بیانیاں ظاہر کیں؟ اور اگر اس وقت نہیں تو کیا اس کے بعد چودہویں صدی تک ان مصنّفین حدیث کی افتراء پردازیوں کی حقیقت جو اس صدی میں منکرین حدیث پر منکشف ہوئی کسی اور مسلمان پر بھی منکشف ہوئی؟ اگر نہیں منکشف ہوئی تو مسلمانوں سے زیادہ گمراہ اور جاہل قوم دنیا میں کوئی نہ گزری ہوگی، کہ یہ قوم ساڑھے گیارہ سو برس تک ایک چیز کو اصول دین میں سے سمجھتی رہی اور اس طویل مدت میں کسی کو اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا استغفر اللہ کون باحمیت مسلمان ہوگا جو اس یاوہ گوئی کا تحمل کر سکے گا۔

منکرین حدیث کا یہ اقدام نہایت خطرناک ہے

پھر میں ان منکرین حدیث سے پوچھتا ہوں کہ اگر دوسری صدی کے نصف اول ہی میں (معاذ اللہ) مسلمانوں کی بے دینی و بے حمیتی اور ان کی ایمانی و اخلاقی کمزوری کا یہ حال ہو گیا تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ مسلمانوں نے افتراء پردازیاں کیں اور پے در پے کرتے رہے اور مسلمانوں کو قرآن کریم اور اس کی تعلیمات سے بے توجہ و بے پروا اور ناواقف بنانے کی تدبیریں عمل میں لاتے رہے اور دین قیم میں ہزاروں لایعنی باتیں ہزاروں خلاف قرآن عقائد و اعمال ہزاروں مخالف عقل و دوراز کار افسانے داخل کرتے رہے اور ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر سینکڑوں ناجائز تہمتیں تراشتے رہے اور سارے مسلمانان عالم ان شرم ناک حرکات کا خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے کسی نے ان مفتریوں کے مقابلہ میں اپنی ایمانی و اخلاقی جرأت سے کام نہ لیا، اور کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور ناموس کی حفاظت اور قرآن کریم کی حمایت کے لئے کھڑا نہیں ہوا، اور شریعت مطہرہ میں اس قدر تحریفات ہوتے دیکھ کر

بھی کسی کی رگ رحمیت نہ پھڑکی، گو اگر کوئی غیر مسلم آپ سے پوچھے کہ جب ان مسلمانوں کا یہی حال تھا تو کیا اطمینان ہے کہ قرآن کریم ان کے ناروا تصرفات سے سالم رہا ہوگا، اور کیا توقع ہے کہ ان مسلمانوں نے اس کو بجنسہ محفوظ رکھنے کے لئے کوئی کوشش کی ہوگی منکرین حدیث بتائیں کہ اس غیر مسلم کو وہ کیا جواب دیں گے؟

انکار حدیث کا لازمی نتیجہ انکار قرآن ہے

منکرین حدیث خوب اچھی طرح غور کرلیں کہ ایسی متواتر چیزوں کے انکار اور ایسے تواتر کو بے اعتبار کردینے کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ ان کے ہاتھوں سے قرآن کریم بلکہ خود رسول خدا (ﷺ) کا دامن بھی چھوٹ جائے گا، اس لئے کہ ان سب چیزوں کے ثبوت کا مدار سوائے اخبار متواترہ کے اور کسی چیز پر نہیں ہے میں ہر چند غور کرتا ہوں لیکن کسی طرح یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ منکرین حدیث کو عقل وخرد سے اتنی بے گانگی کیوں ہے، آخر یہ کس عقل کا تقاضا ہے کہ کتب احادیث میں جو اقوال وافعال نبوی آنحضرت ﷺ سے لے کر ان کتابوں کے مصنفین تک مسلسل راویوں کے بیان و شہادت کے ذریعہ منقول ہوتے ہیں ان کو بے اعتبار و ناقابل قبول کہہ دیا جاتا ہے لیکن کتب تاریخ میں جو واقعات و حالات مذکور ہیں باوجودیکہ ان کی کوئی سند مذکور نہیں ہے۔ پھر بھی وہ سب مسلم و قبول ہیں۔

ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اور اس سے زیادہ بے خردی کا مظاہرہ یوں کیا جاتا ہے کہ یورپ کا ایک دشمن اسلام مصنف آنحضرت ﷺ کے ایک ہزار سال بعد پیدا ہوتا ہے اور محض اپنے قیاس و تخیل سے آنحضرت ﷺ یا قرآن یا اسلام یا حدیث یا کسی تاریخی واقعہ کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرتا ہے تو ان مدعیان عقل کے نزدیک وہ ایسی یقینی بات ہو جاتی ہے کہ اس کو پیام جبرئیل سے کم نہیں سمجھتے لیکن اخیار امت محمدیہ اور علمائے سلف امور مذکورہ کے عینی شاہدوں کا بیان باسناد متصل پیش کریں تو اصلاً ناقابل التفات اور

قطعاً غیر معتبر و نا قابل قبول۔

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبلیست

تیسرا وسوسہ: جو انکار حدیث کا حیلہ بن جاتا ہے یہ ہے کہ حدیثوں میں بہت سی باتیں خلاف عقل ہیں اور خلاف عقل باتیں قابل تسلیم نہیں ہیں۔

اس کا جواب: یہ ہے کہ انکار حدیث کی یہ سب سے بھونڈی وجہ ہے منکرین حدیث کو اس وجہ کے ذکر کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ وہ عقل کا ایک خاص معیار پیش کرتے، اور اس معیار کا ثبوت قرآن کریم سے دیتے یا کم از کم اس معیار پر تمام یا اکثر عقلاء کا اتفاق پیش کرتے، یا یہ بھی نہیں تو اس معیار پر کوئی ایسی عقلی دلیل قائم کرتے جس سے اکثر منصف مزاج لوگ مطمئن ہو جاتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور نہ ایسا کوئی معیار پیش کرنا ان کے امکان میں ہے ہر واقف کار جانتا ہے کہ دنیا میں کوئی معیار عقل چند دنوں سے زیادہ قائم نہ رہ سکا فلسفہ قدیم اور فلسفہ جدید دونوں کی تاریخیں پڑھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ آج جو معیار عقل و دانش قرار دیا گیا، کل اس کو غلط اور لغو بتایا گیا ابھی کل تک جو چیزیں ناممکن سمجھی جا رہی تھیں آج ہم ان کو اپنے مشاہدہ میں پاتے ہیں علاوہ بریں میں منکرین حدیث سے پوچھتا ہوں کہ عقل کو معیار رد و قبول قرار دینے میں کیا صورت اختیار کرتے ہیں، اگر وہ کچھ خاص نوعیت کے اشخاص کی عقلوں کو معیار بتاتے ہیں، تو ان کو بتانا ہوگا کہ کس نوعیت کے لوگوں کی عقلیں معیار ہوں گی اور اس نوعیت کی تخصیص کا کیا ثبوت ہے؟ اور اس خاص نوعیت کے اشخاص کی تعیین و انتخاب میں اختلاف ہوگا، تو اس کا فیصلہ عقل سے ہوگا یا نقل سے اگر عقل سے ہوگا تو پھر وہی سوالات ہوں گے اور اگر نقل سے ہوگا، تو وہ نقل کیا ہے اور اگر ہر شخص کی عقل معیار ہے تو گزارش ہے کہ جب ہر شخص اپنی عقل کے لحاظ سے مکلّف ہے تو آپ حضرات نے یہ حماقت کیوں کی کہ اپنے خیالات و عقائد کا دوسروں کو پابند کرنے کے لئے رسالے نکالے مضامین چھپوائے اور کتابیں شائع کیں اگر کوئی شخص حدیثوں کو واجب التسلیم کہتا ہے، اور ان کے مضامین کو

خلاف عقل نہیں سمجھتا تو آپ کیوں حدیثوں کو خلاف عقل باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں منکرین حدیث نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر حدیثوں کے انکار کے لئے ان کا یہی حیلہ کافی ہے تو حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا عذر خدا نے کیوں نہ مان لیا، آخر انہوں نے بھی تو تعلیمات شعیب علیہ السلام کے قبول کرنے سے اسی لئے انکار کیا تھا کہ یہ تعلیمات ہماری عقل میں نہیں آتیں "قالوا یٰشعیبُ ما نفقه کثیرًا مِمَّا تقول" (اے شعیب تمہاری بہت سی باتیں ہم نہیں سمجھتے ہماری عقل میں نہیں آتیں) اسی طرح یہودیوں نے بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا "قلوبنا غلف" ہمارے دل بند ہیں اس میں آپ کی باتیں نہیں سماتیں یعنی آپ کی باتیں خلاف عقل وفہم ہیں منکرین حدیث کے اصول پر انکا عذر نہایت معقول تھا، مگر خدا نے اس عذر کی مطلق سماعت نہیں فرمائی، بلکہ ان کا یوں رد کیا "بل لعنهم الله بکفر هم فقلیلا ما یؤمنون" یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں خلاف عقل نہیں ہیں، بلکہ منکرین پر خدا نے ان کے انکار کی وجہ سے لعنت کر دی ہے، اب ان سے ایمان کی توقع بہت کم ہے، اسی طرح مشرکین نے بھی بہانہ نکالا تھا کہ "قلوبنا فی اکنة مما تدعونا الیه" (یعنی جس بات کی طرف ہم کو آپ دعوت دیتے ہیں ان کی نسبت ہمارے دل پردے میں ہیں) منکرین حدیث کے خیال سے تو یہ بڑی اٹل دلیل انکار رسول کی ہے مگر درحقیقت وہ ایسا لغو اعتراض کر کے مکذبین انبیاء علیہم السلام کے پیرو بن رہے ہیں، "لبئس ماکانوا یعملون."

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج تک منکرین حدیث نے کوئی خلاف عقل حدیث پیش نہیں کی اور جن حدیثوں کو وہ خلاف عقل سمجھ کر پیش کرتے ہیں، درحقیقت وہ خلاف عقل نہیں ہیں بلکہ خود ان کی عقل نارسا کا قصور ہے، اس کے علاوہ ان احادیث کے مضامین اکثر و بیشتر قرآن کریم سے ثابت ہیں، مثلاً بہت سے عقل پرست حشر ونشر اجساد، قیامت ملائکہ، معراج جسمانی عذاب وثواب، برزخ اور جنت ودوزخ وغیرہ کو خلاف عقل کہتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی چیز خلاف عقل نہیں

ہے، اور یہ ساری چیزیں صرف احادیث سے نہیں، بلکہ قرآن کریم سے بھی ثابت ہیں پس اگر انکار حدیث کی یہی بنیاد ہے، تو منکرین حدیث کو سب سے پہلے قرآن کریم سے ہاتھ اٹھانا پڑے گا "اعاذنا اللّٰه وایَّاهُمْ مِنْ ذٰلك."

پھر یہ حیلہ اصولی طور پر انکار حدیث کی علت کسی طرح نہیں بن سکتا، بلکہ اگر یہ علت ہر طرح صحیح بھی تسلیم کر لی جائے تو اس کی بنا پر صرف ان احادیث کا انکار صحیح ہو سکتا ہے جن میں خلاف عقل امور مذکور ہیں، پس یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ معدودے چند احادیث کی وجہ سے سارا ذخیرۂ حدیث بے اعتبار و بے کار قرار دے دیا جائے کیا اس کی بعینہٖ وہی مثال نہ ہوگی کہ ایک شخص کے پاؤں میں ناسور ہو جائے اور ڈاکٹر صرف پاؤں کاٹنے کے بجائے اس مریض ہی کا خاتمہ کر دے۔

جی چاہتا تھا کہ اس مسئلہ کو ذرا تفصیل سے لکھوں لیکن افسوس کہ یہ اس تفصیل کا موقع نہیں ہے، آگے ابھی بہت ساری باتیں لکھنی ہیں اس لئے میں اپنے ناظرین سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے معاف فرمائیں۔ اور مزید تفصیل مطلوب ہو تو علامہ یراحمد صاحب عثمانی دیوبندی کا رسالہ العقل والنقل ملاحظہ فرمائیں۔

منکرین حدیث کو جو وسوسے پیش آئے ہیں میں نے ان کو مع جواب کے ذکر کر دیا، ممکن ہے کچھ اور وسوسے بھی ان کے دل میں آتے ہوں لیکن مذکورہ بالا وسوسوں سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ منکرین حدیث کے وسوسے کہاں تک قابل توجہ و التفات ہو سکتے ہیں، اور سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کسی عاقل کو ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی نامعقولیت بوداپن اور کمزوری میں شک ہو سکتا ہے؟ اس لئے مزید تطویل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

یہاں تک جو کچھ مذکور ہوا یہ درحقیقت رسالۂ مذکورہ کا اصولی رد، یا اس پر اجمالی تبصرہ تھا اب میں چاہتا ہوں کہ رسالۂ مذکورہ پر تفصیلی تبصرہ کر کے اس کے تار تار الگ کر دوں۔ "واللّٰه الموفق."

منکرین حدیث کے رسالہ مذکورہ
پر
تفصیلی تبصرہ

رسالہ زیر نظر کی ابتدائی سطروں میں ''حق گو'' صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ:

> ''مخالفین اسلام نے قرآن واسلام پر جو حملے کئے ہیں، ان کی لفظ بہ لفظ تائید کتب حدیث سے ہوتی ہے۔''

پھر انہوں نے مختلف عنوان قائم کر کے گیارہ صفحات میں اس دعویٰ کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہ تو ''حق گو'' صاحب کو آگے چل کر معلوم ہو جائے گا کہ ان کا یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے، اور وہ اس کو ثابت کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، سردست میں ان سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں اگر بفرض محال ان کا دعویٰ صحیح بھی ہو، اور ان کے دلائل بھی سب درست ہوں، تو اس سے زیادہ سے زیادہ صرف یہ لازم آتا ہے کہ جن حدیثوں سے مخالفین کے حملوں کی تائید ہوتی ہے، وہ قابل تسلیم نہیں ہیں، لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ بقیہ حدیثیں بھی لائق اعتبار نہیں ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ بجائے مخصوص احادیث کے منکرین حدیث ساری حدیثوں کا انکار کرتے ہیں۔ آخر یہ کس عقل کا تقاضا ہے کہ پاؤں کے ناسور کی وجہ سے بجائے پاؤں کاٹنے کے خود مریض ہی کو قتل کر دیا جائے۔

پھر یہ عجیب ذہنیت ہے کہ مخالفین کے لغو اور بے ہودہ اعتراضات کی وجہ سے اپنے مسلمات کو خیر باد کہہ دیا جائے، اگر منکرین حدیث کا یہی اصول ہے، تو حدیث

سے پہلے ان کو قرآن کریم سے انکار کرنا پڑے گا، کیا ان کو معلوم نہیں ہے کہ مخالفین اسلام نے براہِ راست قرآن کریم پر بھی حملے کئے ہیں، کیا ان کو خبر نہیں ہے کہ دشمنان اسلام نے قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور قرآنی احکام کے منزل من اللہ ہونے پر بھی نکتہ چینیاں کی ہیں، تو کیا وہ ان نکتہ چینیوں کی وجہ سے قرآن سے روٹھ جائیں گے؟

''حق گو'' صاحب نے گویا اپنے دعویٰ کے ثبوت میں سب سے پہلی بات تو یہ لکھی ہے کہ حدیثوں سے قرآن کا محرف و ناقص ہونا ثابت ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم روافض کو مطعون کیا کرتے ہیں کہ وہ قرآن کو محرف و ناقص بتاتے ہیں لہٰذا وہ قطعی کافر ہیں، مگر کیا یہ حدیثیں صحاح ستہ کی نہیں ہیں۔''

اس کے بعد چند حدیثوں کے ترجمے اس غرض کے لئے نقل کئے ہیں کہ ان سے قرآن کا محرف و ناقص ہونا ثابت ہے۔

لیکن مجھ کو بے حد افسوس ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے یہاں پر انتہائی خیانت اور حد درجہ سفاہت اور بے عقلی کا ثبوت دیا ہے، کسی بات کے سمجھنے سے پہلے بول دینے کا ہمیشہ یہی نتیجہ ہوتا ہے، کہ بولنے والے کی حماقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ''حق گو'' صاحب کو خبر تو ہے نہیں کہ شیعوں کا عقیدہ قرآن کی نسبت کیا ہے، اور جو حدیثیں انہوں نے نقل کی ہیں، ان میں کیا بیان ہے، مگر خواہ مخواہ اس لئے کہ ہم بھی پانچویں سواردں میں لگے ان عملی مسائل کی ٹانگ توڑنے، اس لئے میں پہلے شیعوں کا عقیدہ ''حق گو'' صاحب کو بتاتا ہوں، اس کے بعد ان کی ذکر کی ہوئی حدیثوں کا مفہوم ان کو ذہن نشین کراؤں گا۔

روافض کا عقیدۂ تحریف قرآن

''حق گو'' صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ روافض قرآن کریم کی نسبت یہ عقیدہ

رکھتے ہیں کہ:

> ”آنحضرت ﷺ پر جو قرآن نازل ہوا تھا، اس کا پورا حافظ بجز حضرت علی کے کوئی نہ تھا، اور اس قرآن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بقیہ گیارہ ائمہ معصومین کی ولایت و امامت کی نام بنام تصریح و تنصیص تھی، اور وہ موجودہ قرآن سے بہت بڑا تھا، اس قرآن میں ستر ہزار آیتیں تھیں مگر جب عہد صدیقی میں قرآن جمع کیا گیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کے بہت سے الفاظ بدل دیئے، اور بہت سے کلمات نکال ڈالے، امامت ائمہ والی آیتیں بالکل حذف کر ڈالیں، کچھ آیتیں صحابہ رضی اللہ عنہم نے خود بنا کر داخل قرآن کر دیں، اور اس کی ترتیب بھی گڑ بڑ کر دی۔“[1]

اور رافضی مصنّفین اقرار کرتے ہیں کہ اس مضمون کی متواتر روایتیں ائمہ معصومین رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں، اور اقرار کرتے ہیں کہ ان روایتوں سے قرآن کا محرف ہونا صراحۃً ثابت ہے، اور اقرار کرتے ہیں کہ اسی بنا پر علمائے مذہب شیعہ کا عقیدہ ہے، کہ قرآن محرف ہے۔[2] اتنا معلوم کرنے کے بعد ”حق گو“ صاحب اپنی پیش کردہ روایات پر ایک بار پھر نظر ڈال کر بتائیں کہ ان روایات سے عقیدہ مذکورہ رافضہ کا کون سا جز ثابت ہوتا ہے؟

”حق گو“ کی پیش کردہ روایات کا مفہوم

”حق گو“ صاحب کو اگر عقل سے دور کا علاقہ بھی ہوتا، تو وہ سمجھ سکتے کہ ان کی پیش کردہ روایتوں میں سوائے اس کے اور کچھ مذکور نہیں ہے کہ ایک آیت اتری پھر

---

[1] ثبوت کے لئے دیکھو اصول کافی طبع لکھنو ص۲۶۲، ص۲۷۱، ۲۶۷ احتجاج طبرسی مطبوعہ ایران ص۱۱۹ تا ۱۳۲ دیباچہ تفسیر صافی طبع ایران، تفسیر قمی طبع ایران فصل الخطاب ص۹۷

[2] فصل الخطاب طبع ایران

اس کی تلاوت ہوگئی، یا یہ کہ فلاں سورت میں فلاں آیت بھی عہد نبوی میں پڑھی جاتی تھی، یا یہ کہ فلاں آیت کو ایک صحابی یوں پڑھتے تھے، اور دوسرے صحابی دوسری طرح پڑھتے تھے، لیکن ان تینوں باتوں میں سے کسی سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن میں جامعین قرآن رضی اللہ عنہم نے تحریف کردی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس روایت میں کسی آیت کی تلاوت کا موقوف ہوجانا مذکور ہے، اس کا صاف وصریح مفہوم یہ ہے کہ اس آیت کی تلاوت کو خود خدا نے موقوف فرمادیا اور ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ صاحب کتاب کا اپنی کتاب کے کسی حصہ کو اپنی کتاب سے نکال دینا تحریف نہیں ہے، تحریف تو اس کو کہتے ہیں کہ صاحب کتاب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس کی کتاب میں اس قسم کا تصرف کرے۔

اسی طرح جن روایات میں یہ مذکور ہے کہ فلاں سورۃ میں فلاں آیت بھی عہد نبوی میں پڑھی جاتی تھی، ان میں بھی تحریف قرآن کا کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔

ایک اعتراض کا جواب

اگر آپ کہیں کہ ہاں روایات میں یہ تو نہیں ہے، لیکن جس آیت کا ذکر ان روایات میں ہے وہ قرآن میں نہیں ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآن محرف ہے، تو میں کہوں گا، کہ یہ آپ کی غلط فہمی ہے قرآن میں اس آیت کے نہ ملنے پر بھی قرآن کا محرف ہونا ثابت نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ یہ نہ ثابت کیجئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس آیت کو قرآن سے نکالا، اور اس کو آپ ہماری کسی روایت سے ثابت نہیں کر سکتے اصلیت یہ ہے اور ان روایات کا مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ آیت پڑھی جاتی تھی لیکن پھر خدا نے اس کی تلاوت موقوف کردی کسی آیت کی تلاوت کا منسوخ کردینا ایک قسم کا نسخ ہے، اور اس کا ثبوت خود قرآن کریم میں ہے جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

اختلاف قرأت کی حیثیت

اور تیسری قسم کی روایات جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اختلاف قرأت کا ذکر ہے، ان کو بھی تحریف کے مسئلہ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، اختلاف قرأت کی قریب قریب وہی حیثیت ہے جو کتابوں میں نسخوں کے اختلاف کی حیثیت ہوتی ہے تو جس طرح کہ ان مختلف نسخوں میں سے جس نسخے کو پڑھنے والا چاہے اختیار کر سکتا ہے، اور اس پر الزام تحریف عائد نہیں ہو سکتا، اسی طرح قرآن کریم کے بعض، الفاظ وکلمات میں مختلف قرأتیں ہیں اور وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ثابت ہیں جس صحابی نے جو لفظ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، اگر اس کو اسی طرح پڑھا تو اس کو تحریف کہنا سراسر جہالت ہے۔

تمثیل

کے طور پر سنئے کہ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کے پہلے مصرع میں دو نسخے ہیں: ؎

عزیزے کہ ہر کزورش سر بتافت
بہر ور کہ شد ہیچ عزت نیافت
عزیزے کہ از ور گہش سر بتافت
بہر ور کہ شد ہیچ عزت نیافت

جس کا مطلب یہ ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے دونوں طرح پڑھنے کی اجازت ہے لہٰذا ان میں سے جو نسخہ کسی نے پڑھا خطا وار نہ ہوگا نہ اس پر تحریف کا الزام عائد ہوگا پس اسی پر اختلاف قرأت کے مسئلہ کو قیاس کر لیجئے۔

نسخ کی تعریف اور اس کا ثبوت

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ”حق گو“ صاحب نسخ کے منکر ہیں اور ان کو نسخ و تحریف کا

فرق بھی معلوم نہیں ہے، اسی وجہ سے ان کو اپنی پیش کردہ روایات کے صحیح مفہوم تک رسائی نہ ہو سکی، اور اپنی ناواقفیت کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ روایات تحریف قرآن پر دلالت کرتی ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے سامنے نسخ کی تعریف اور اس کا ثبوت پیش کیا جائے۔

نسخ کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی آیت کی صرف تلاوت یا اس کے حکم یا دونوں کو اس لئے موقوف کر دے، کہ اس کی مدت ختم ہوگئی، اور چونکہ اس کا نفاذ اتنے ہی زمانہ کے لئے ہوا تھا، اور جو غرض اس کے نفاذ سے وابستہ تھی، وہ حاصل ہوگئی لہٰذا اب آئندہ اس کو موقوف کیا جاتا ہے۔

ہر ملت و مذہب میں ناسخ و منسوخ کی مثالیں موجود ہیں، اور اس کا راز یہ ہے کہ اصلاح چاہے جسمانی ہو یا روحانی اصول کے ساتھ اور بتدریج ہو تو بہت مفید و نافع ہوتی ہے، اور اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے، اور اس طرح مرض کا دفعیہ بھی بالکلیہ ہوتا ہے اور مریض کو زیادہ مشقت و دشواری بھی پیش نہیں آتی اور اس اصولی و تدریجی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ پہلے مریض کو کوئی آسان طریق اصلاح بتا کر اس کا پابند بنایا جائے جب کچھ دن گزر جائیں، اور طبیعت میں دوسرے علاج کے لئے مناسب استعداد پیدا ہو جائے، تو پہلے علاج کو موقوف کر کے دوسرے کی ہدایت کی جائے، اور یونہی رفتہ رفتہ مرض کے جملہ اسباب کو فنا کرنے اور طبیعت کو اس کے اصلی اعتدال پر لانے کی تدبیر کی جائے۔

فرض کیجئے ایک شخص کا خون فاسد ہو گیا ہے، اور وہ اس کی وجہ سے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہے جب یہ آدمی طبیب کے پاس جائے گا تو طبیب پہلے منضج کا نسخہ لکھے گا، اور ایسی دوائیں دے گا، کہ مادہ میں پختگی آجائے، کچھ دنوں کے استعمال سے جب یہ غرض حاصل ہو جائے گی، تو طبیب نسخہ بدل دے گا، اور بجائے اس کے دست آور دوائیں دے کر مواد فاسد کا اخراج کرے گا، لیکن چونکہ مواد فاسد کے ساتھ

ساتھ کچھ صالح اجزاء بھی خارج ہو جاتے ہیں، اور مریض کو نقاہت ہو جاتی ہے، اس لئے پھر تیسرا نسخہ لکھے گا، تا کہ اس نقصان کی تلافی ہو اور نقاہت رفع ہو جائے۔

اسی مثال پر روحانی اصلاح کو بھی قیاس فرمائیے، کہ جب کسی قوم میں اخلاقی امراض پیدا ہو جاتے ہیں، اور ان کی روحانی حالت بہت بدتر ہو جاتی ہے، تو اللہ رب العزت اپنی غایت رافت و وفور رحمت سے اس کی اصلاح کے لئے کسی طبیب روحانی (رسول) کو مبعوث فرماتا ہے، اور چونکہ خدا اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے، اس لئے یک بارگی ان پر سخت سخت پابندیاں عائد نہیں کرتا، بلکہ بتدریج ان کی اصلاح کی تدبیر کرتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک حکم دے کر اس کی پابندی کراتا ہے، پھر جب دوسرے حکم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، تو پہلا حکم اٹھا کر دوسرے کی پابندی لازم کرتا ہے اسی کو اصطلاح شریعت میں نسخ کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک صورت اور بھی ہوتی ہے، آپ نے جسمانی اصلاح کے سلسلہ میں بار بار مشاہدہ کیا ہوگا کہ اطبائے جسمانی ایک ہی مرض کا مختلف علاج کرتے ہیں جس کی وجہ بعض دفعہ یہ ہوتی ہے کہ اس مرض کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا پہلے طبیب یہ دیکھتا ہے کہ یہ مرض کیوں پیدا ہوا پس جو سبب اس کو معلوم ہوتا ہے، اسی کے دفعیہ کی کوشش کرتا ہے، مثلاً بخار ایک مرض ہے لیکن اس کے اسباب مختلف ہیں کسی کو بخار آتا ہے، اور اس کا سبب فساد بلغم ہوتا ہے، اور کسی کو فساد صفراء کی وجہ سے بخار آتا ہے، پس باوجودیکہ مرض ایک ہی ہے لیکن علاج مختلف ہوگا، ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ تدابیر اختیار کرے گا۔

اور بعض دفعہ اختلاف علاج کی وجہ زمانہ یا مقام یا مزاج کا اختلاف ہوتا ہے ایسا بہت ہوتا ہے، کہ ایک خاص طریق علاج ایک خاص مرض کے لئے موسم گرما میں مفید واقع ہوتا ہے لیکن وہی علاج اسی مرض کے لئے سردیوں میں مفید نہیں ہوتا، ایک علاج گرم ممالک میں کسی خاص مرض کے لئے تیر بہدف ثابت ہوتا ہے، لیکن سرد

ملکوں میں اس سے کوئی نفع نہیں ہوتا، یا گرم مزاج والے کے لئے نافع ہوتا ہے اور سرد مزاج والے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

بالکل یہی حال روحانی علاج کا بھی ہے، کہ ایک قوم کے لئے جو اصلاحی تدبیر اختیار کی جاتی ہے، وہ تدبیر بعض اوقات میں دوسری قوم کے لئے زمانہ کے بدل جانے سے یا اختلاف مزاج یا تفاوت اسباب کی وجہ سے مفید نہیں ہوتی، اس لئے اللہ رب العزت قوموں کی اصلاح کے لئے جو شریعتیں نازل کرتے ہیں، بسا اوقات ان کے احکام میں ترمیم و تنسیخ بھی فرماتے ہیں، نسخ کی ایک صورت یہ بھی ہے، میرے اس بیان سے نسخ کی حقیقت آپ نے سمجھ لی ہوگی اور آپ کو یقین ہو گیا ہوگا کہ ہر اصلاحی تحریک اور ہر حکیمانہ طریق علاج کے لئے نسخ ضروری چیز ہے، اور شرائع الٰہیہ میں ناسخ و منسوخ کا وجود عیب و نقص نہیں، بلکہ ان کا حسن و کمال ہے لیکن جن لوگوں نے نسخ کی حقیقت کما حقہ نہیں سمجھی ہے ان کو مختلف قسم کے وسوسے پیدا ہوتے ہیں، ایک جماعت نے یہ خیال کیا کہ نسخ سے باری تعالیٰ کا جہل لازم آتا ہے، اس جماعت کو نسخ پر بدا کا دھوکا ہو گیا، اور ان دونوں کو اس نے ایک سمجھ کر یہ خیال قائم کرلیا، حالانکہ دونوں میں بڑا عظیم الشان فرق ہے، بدا کی حقیقت یہ ہے کہ ایک حکم دینے کے بعد حکم دینے والے کا علم بدل جائے، اس کی رائے میں انقلاب پیدا ہو جائے، اور اس حکم کو واپس لے لے اور اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کرے، برخلاف نسخ کے کہ اس میں علم نہیں بدلتا بلکہ اس میں پہلے ہی سے یہ علم رہتا ہے، کہ حکم اول ایک خاص مدت تک کے لئے ہے اس کے بعد دوسرا فلاں حکم نافذ کیا جائے گا، اور پہلے کو موقوف کر دیا جائے گا کیا طبیب کو منضج کا نسخہ لکھنے کے وقت یہ علم نہیں ہوتا کہ اس نسخہ پر پانچ سات دن سے زیادہ عمل نہ کرایا جائے گا، اور کیا جب مسہل تجویز کرتا ہے، تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں نے منضج دینے میں غلطی کی تھی اور اب اس غلطی پر متنبہ ہو کر دوسری رائے قائم کرتا ہوں، ہرگز نہیں، اسی مثال پر نسخ کے احکام کو بھی

قیاس کیجئے، تو آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ، نسخ دلیل جہل نہیں، بلکہ نہایت زبردست حکمت اور ایک عظیم الشان علم کی روشن دلیل ہے۔

بعض مشرکین اور یہود کو اسی قسم کے شبہات پیش آئے، اور اسی بنیاد پر انہوں نے قرآن و مبلغ قرآن کے حق میں زبان طعن دراز کی، تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿وَ اِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ ۙ وَّ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝﴾[1]

ترجمہ: ''جب ہم کسی آیت کے عوض میں دوسری آیت نازل کرتے ہیں اور اس کی حکمت و مصلحت کو خوب جانتے ہیں تو مخالفین کہتے ہیں کہ (اے رسول) تم تو بس افتراء پرداز ہو (خدا کہتا ہے کہ ہمارا رسول افتراء پرداز نہیں ہے) بلکہ مخالفین میں سے اکثر و بیشتر اشخاص جاہل اور ہماری مصلحتوں سے ناواقف ہمارے کاموں کی حکمتوں سے بے علم ہیں۔''

اس آیت سے نسخ کی حکمت کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو وحی نبی عربی روحی لہ الفداء پر نازل کی ہے، اس میں بھی بعض چیزوں کو ایک خاص وقت تک کے لئے نازل کیا، اور پھر اس کو منسوخ فرما دیا، جس پر مشرکین معترض ہوئے اسی مضمون کو ایک دوسری آیت میں بھی بیان کیا ہے۔

﴿مَا ننسخ من آیۃ او ننسھا ناتِ بخیرٍ مِنھَا اَوْ مثلھا اَلَمْ تَعۡلَمْ اَنَّ اللّٰہ علی کل شیءٍ قَدِیۡر.﴾[2]

ترجمہ: ''یعنی جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو (لوگوں کے دلوں سے) فراموش اور محو کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کے مثل

---

[1] سورہ نحل پ ۱۴ [2] بقرہ

(دوسری) لاتے ہیں کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اس آیت میں بھی وہی حکمت سمجھائی گئی ہے، کہ جب کوئی آیت منسوخ کی جاتی ہے تو اس کے بدلے اس سے اچھی یا ویسی ہی دوسری چیز لائی جاتی ہے، مگر چونکہ پہلی چیز کا اب وقت نہیں رہا، اس لئے وہ منسوخ کردی جاتی ہے۔

یہ دونوں آیتیں نسخ کے اثبات میں ایسی صریح ہیں کہ ان کے بعد کوئی ادنیٰ درجہ کا مؤمن بھی نسخ کا انکار نہیں کرسکتا، جب یہ ثابت ہو چکا تو اب سنئے کہ نسخ کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ کوئی آیت قرآن میں نازل کی گئی، اور کچھ دنوں تک اس کی تلاوت جاری رکھی، پھر کسی خاص مصلحت سے اللہ تعالیٰ نے اس کی تلاوت موقوف کردی، مثلاً جب اصحاب بیر معونہ نہایت بیدردی سے شہید کئے گئے، اور تمام مسلمانوں کو عموماً اور ان کے اعزہ کو خصوصاً نہایت صدمہ پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دلدہی وتسلی اور شہداء کی مقبولیت اور ان کی عزت وحرمت کے اظہار کے لئے ایک آیت نازل فرمائی، جب کچھ دنوں تک اس کی تلاوت ہو چکی اور مسلمانوں کے زخم مندمل ہو چکے، اور شہداء کی عزت وحرمت دلوں میں راسخ ہو چکی، تو اس آیت کی تلاوت موقوف کردی گئی، اسی کا نام اصطلاح میں نسخ تلاوت ہے۔

تحریف ونسخ کا فرق

بہت سے کم علم یا ابلہ فریب لوگ تحریف ونسخ میں فرق نہیں کرسکے اور نسخ تلاوت کی روایات کو تحریف کے ثبوت میں حماقت یا بے حیائی سے پیش کردیتے ہیں، حالانکہ دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے، اوپر کے بیان سے آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا، کہ نسخ اس تصرف وتبدل کا نام ہے، جو کتاب کے نازل کرنے والے خود اللہ جل مجدہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے، اور تحریف کا یہ مطلب ہوتا ہے، کہ خدا کے علاوہ کوئی دوسرا خدا کے حکم ومرضی کے خلاف اس کی کتاب میں کوئی تصرف بے جا

کرے، دیکھئے مصنّفین اپنی تصنیفات میں رات دن محو و اثبات ترمیم و تنسیخ اور اصلاح و اضافہ کرتے رہتے ہیں، اور دنیا میں کوئی دشمن خرد ایسا نہیں ہوا، جو اس کو تحریف کہتا ہو لیکن ایک دوسرا شخص اس کتاب کا ایک لفظ بھی بدل دے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے کتاب میں تحریف کر دی جب یہ فرق ذہن نشین ہو گیا، تو اب سنئے کہ روافض کا عقیدہ ہے کہ کتاب اللہ میں کچھ انسانوں نے بہت سے بے جا تصرفات کئے ہیں، لہٰذا روافض تحریف قرآن کے قائل ہوئے، اور آپ نے ہماری جو روایتیں پیش کی ہیں ان میں انسانوں کے تصرف کا کوئی ذکر نہیں بلکہ خدا کے تصرف کا ذکر ہے لہٰذا ہم اہلسنّت کو قائل تحریف کہنا جہالت اور افتراء ہے۔

انبیاء کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا

'حق گو' صاحب نے دوسری بات یہ لکھی ہے:

> ''ہم روافض کو طعنہ دیا کرتے ہیں کہ انہوں نے نبوت اور خلافت راشدہ کو ذاتیات و نفسیات سے ملوث کیا مگر کس منہ سے؟ کیا یہ حدیث حضرت عائشہ کی مسلم میں موجود نہیں ہے۔''

اس کے بعد اس حدیث کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے جس میں حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آدمی بھیج کر ترکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا حصہ مانگنا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ جواب دینا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اور یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں اپنے صدقے کو جس طرح تقسیم کرتے تھے، اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا، اس پر فاطمہ رضی اللہ عنہا کا خفا ہو جانا اور ملاقات چھوڑ دینا، اور جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خبر نہ کرنا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تنہا ان کی نماز جنازہ پڑھ کر رات ہی کو دفن کر دینا مذکور ہے۔

میں حیران ہوں کہ ''حق گو'' صاحب کو عقل سے اتنی دشمنی کیوں ہے؟ ہم نے تو اس حدیث کے ایک ایک فقرہ کو بار بار پڑھا، لیکن ہم کو ''حق گو'' صاحب کے دعویٰ سے متعلق کوئی بات بھی نہیں ملی، صحیح مسلم کے علاوہ یہ حدیث صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں بھی ہے، اور ان کے اردو تراجم بکثرت دستیاب ہو سکتے ہیں، ہم اردو خواں طبقہ سے اپیل کرتے ہیں، کہ وہ لوگ پوری حدیث پڑھ کر انصاف سے کہیں کہ جب شیعوں اور سنیوں کی متفق علیہ حدیث[1] میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے، کہ انبیاء علیہم السلام کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوتی، رسولوں کا متروکہ صدقہ ہوتا ہے، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا متروکہ رسول اللہ ﷺ کو تقسیم نہ کرنا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حصہ نہ دینا نفسانیت ہے یا عین للّٰہیت اور اتباع رسول؟

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے سیدۃ النساء کا ناراض ہونا

اور اس پر اگر حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا خفا ہوگئیں تو یہ ان کی لغزش تھی، یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی؟ اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ دی تو اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کون سا قصور ہے؟ ہاں اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اطلاع کی ہوتی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بلا عذر شرعی شریک جنازہ نہ ہوتے، تو بے شک ان کا قصور تھا، مگر یہاں تو صاف تصریح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خبر نہیں بھیجی بہر حال روایت سے خلیفہ راشد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نفسانیت کسی طرح ثابت نہیں ہوتی، ہاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک طرح کی کمزوری ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ حضرات انسان تھے، اور انسانی کمزوریوں سے پاک نہ تھے خطا و لغزش سے منزہ و معصوم نہ

---

[1] شیعوں کی سب سے مستند کتاب کافی کا مطالعہ کرو

تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جواب بالکل حق وصواب تھا، لیکن ان حضرات نے کامل مکرر غور نہ فرمایا، اس لئے رنجیدہ خاطر ہو گئے، لیکن بعد میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حق بجانب ہونا ظاہر ہو گیا تو یہ رنجش جاتی رہی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق بجانب ہونے کی بڑی زبردست دلیل یہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مسند آرائے خلافت ہوئے، تو انہوں نے بھی فدک وغیرہ کو یعنی ان جائدادوں کو جن میں اپنے حصہ کی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دعویدار تھیں، تقسیم نہ کیا، اور ان میں انہی احکام کو جاری رکھا، جو عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر عہد عثمان رضی اللہ عنہ تک جاری تھے، اور رنجش کے رفع ہونے کا ثبوت خود اسی حدیث میں موجود ہے۔ اور بصراحت مذکور ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر میں بلایا، اور بڑی معذرت کی، فرمایا کہ ہم کو تو کبھی یہ وہم بھی نہ ہوا تھا کہ خلافت کا حقدار آپ سے زیادہ کوئی ہو سکتا ہے لیکن ہاں رنج صرف اتنی بات کا تھا، کہ جب آپ سے لوگوں نے بیعت کی تو اس وقت ہم لوگ موجود نہ تھے، کسی نے ہم کو بلا کر ہماری رائے بھی نہ پوچھی، خیر وہ بات تو گزر گئی اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ شام کو مسجد میں علی الاعلان آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں گا، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وعدہ کا ایفاء کیا، اس ملاقات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان مجھے اپنے خاندان سے زیادہ عزیز ہے، میں جو سلوک واحسان اپنے خاندان کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اس کو پہلے خاندان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کروں گا، اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جائداد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قضیہ بالکل نہ چھیڑا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کون لوگ مرتد ہوئے

”حق گو“ صاحب نے تیسری بات یہ کہی ہے:

”روافض کے اس وہم کی یقیناً ہم شدت سے تردید کریں گے کہ

> آنحضرت ﷺ کے بعد بجز معدودے چند صحابہ کے سب مرتد ہو گئے سبحان اللہ ہذا بہتان عظیم مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خود مسلم کی حدیث اس کی تائید میں یہ روایت پیش کر رہی ہے۔"

اس کے بعد "حق گو" صاحب نے حدیث حوض پیش کی ہے، لیکن اس حدیث کو ان کے مدعا سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ حدیث حوض میں زیادہ سے زیادہ یہ مذکور ہے کہ کچھ لوگ میری امت کے لائے جائیں گے، اور ان کو بائیں طرف (یعنی دوزخ کی طرف) لے جایا جائے گا، آنحضرت ﷺ فرمائیں گے کہ یارب یہ تو میرے لوگ ہیں، جواب میں کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے، انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا آپ جب سے ان سے جدا ہوئے، یہ لوگ ہمیشہ پھرتے ہی رہے۔

اس میں اولاً تو صحابہ رضی اللہ عنہم کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ عام امت کے کچھ لوگوں کا ذکر ہے ثانیاً اگر بفرض محال صحابہ رضی اللہ عنہم ہی مراد ہوں، تو کچھ صحابہ مراد ہوں گے اور رافضیوں کا دعویٰ ہے کہ بجز معدودے چند کے سب صحابہ رضی اللہ عنہم مرتد ہو گئے تھے (معاذ اللہ) پھر معلوم نہیں "حق گو" صاحب نے کس طرح یہ کہہ دیا کہ اس حدیث سے رافضیوں کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے، حق گو صاحب کو رافضیوں کی دوستی اور حدیث کی دشمنی میں یہ بھی نظر نہ آیا کہ حدیث میں تو خود یہ بیان موجود ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کون لوگ مرتد ہوئے تھے، اور حدیث زیر بحث کے مصداق کون لوگ ہیں؟

صحیح مسلم (جلد ۱ صفحہ ۳۷) مطبوعہ مجتبائی دہلی میں مذکور ہے کہ:

> "جب آنحضرت ﷺ نے وفات پائی، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو عرب کے کچھ لوگ (جو عہد نبوی ﷺ میں) مسلمان ہوئے تھے مرتد ہو گئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے قتال کیا۔"

اس کے علاوہ تاریخ کی تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ کی

وفات کے بعد جو لوگ مرتد ہوئے تھے وہ بنو حنیفہ وغیرہ کے کچھ لوگ تھے، ان میں کوئی مشہور صحابی نہ تھا۔[1] ثبوت کے لئے دیکھو۔[2]

حدیث وتاریخ کی ان تصریحات سے آنکھیں بند کر کے یہ لکھ دینا کہ حدیث زیر بحث سے رافضیوں کی تائید ہوتی ہے عقل کے خلاف اعلان جنگ نہیں تو اور کیا ہے؟

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب نے مختلف عنوانوں کے تحت وہ روایتیں پیش کی ہیں جن کا تعلق ان کے زعم فاسد میں براہ راست مطاعن رسول اللہ ﷺ سے ہے، پہلا عنوان یہ ہے۔

آنحضرت ﷺ یہودیوں کی خرافات کو سن کر وحی الٰہی کی طرح پیش کرتے تھے

اس عنوان کے ماتحت ''حق گو'' نے دو حدیثیں نقل کی ہیں، پہلی حدیث کا مضمون یہ ہے کہ:

> ''ایک یہودی عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم قبر میں آزمائے جاؤ گے آنحضرت ﷺ نے فرمایا، یہ یہود کے واسطے ہوگا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر چند ہی راتیں گزری تھیں کہ رسول اللہ ﷺ عذاب قبر سے پناہ مانگتے تھے۔''

''حق گو'' صاحب اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

① مشرکین ونصاریٰ کا یہ اعتراض ہے کہ نبی عربی لوگوں کی باتیں سن

---

[1] اور بعض غیر مشہور اشخاص جو صرف ایک بار خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تھے وہ چند دنوں کے بعد ارتداد سے تائب ہو کر مدۃ العمر اسلام کے حلقہ بگوش رہے

[2] کامل ابن ایثر: ۳/۱۳۰ مسعودی: ۵/۱۰۳، تاریخ الخلفاء ص ۵۱

سن کر وحی الٰہی بنا کر پیش کرتے تھے، حدیث سے اعتراض کی تائید ہوتی ہے۔

② حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے، وہ قرآن میں کہیں نہیں ہے۔

③ قرآن میں عذاب قبر کے خلاف متعدد آیتیں موجود ہیں۔

④ خود یہود کا عقیدہ بھی یہ نہیں ہے۔

جواب: حق گو صاحب کی پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث سے اعتراض مذکور کی تائید تو کسی طرح نہیں ہوتی، ہاں اس اعتراض کی تردید ضرور ہوتی ہے اور وہ اس طرح پر کہ اگر مشرکین ونصاری کا یہ اعتراض صحیح ہوتا، تو رسول اللہ ﷺ یہودی عورت کا مقولہ سن کر گھبراتے نہیں، اور نہ چند راتوں کے گزرنے کا انتظار کرتے بلکہ سنتے ہی فوراً فرماتے کہ یہ عورت ٹھیک کہتی ہے، یہودیہ کی یہ بات سن کر گھبرا جانا اور چند راتیں گزرنے پر اس کی تصدیق کرنا ہی تو اس بات کی دلیل ہے، کہ جب تک براہ ت آپ پر منجانب اللہ وحی نہیں آتی تھی، اس وقت تک آپ کسی کی موافقت نہیں فرماتے تھے اور نہ کوئی بات کہتے تھے۔

عیسائی اور یہودی مذہب کی بکثرت تردید قرآن وحدیث میں

اس کے علاوہ مشرکین ونصاری کے الزام کی لغویت یوں بھی ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ دوسروں کی سنی ہوئی باتوں ہی کو وحی بنا کر پیش کرتے، تو قرآن اور احادیث میں یہود ونصاری یا مشرکین کے مسلک کے خلاف کوئی بات نہ ہوتی، لیکن قرآن وحدیث پر ایک سرسری نظر ہی ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان فرقوں کے مسلک کے خلاف بے شمار باتیں شریعت محمدیہ علی صاحبہا التحیۃ میں موجود ہیں کیا خود

قرآن میں بتصریح مذکور نہیں ہے کہ اونٹ کا گوشت بنی اسرائیل کے لئے حرام تھا، مگر شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حلال ہے، کیا قرآن میں مصرح نہیں ہے، کہ مشرکین عرب بحیرۃ وسائبہ وغیرہ کو حرام سمجھتے تھے، مگر شریعت محمدیہ (صلی اللہ علی صاحبہا) نے اس کی مخالفت کی، کیا قرآن میں مصرح نہیں ہے کہ عیسائیوں نے حضرت مسیح کو ابن اللہ اور بعضوں نے الٰہ قرار دیا، لیکن نبی آخر الزماں ﷺ نے اس عقیدہ کی مخالفت اور سخت تردید کی، اور جس طرح یہ باتیں قرآن کریم سے ظاہر ہوتی ہیں اس سے بہت صاف حدیثوں میں مذکور ہیں۔

ایک اعتراض کا جواب

اگر ''حق گو'' صاحب کہیں کہ چونکہ حدیث زیر بحث میں رسول اللہ ﷺ کا یہودیہ کی تصدیق کرنا مذکور ہے اور اسی تصدیق وموافقت سے مخالفین کے الزام کی تصدیق ہوتی ہے، تو میں عرض کروں گا، کہ اگر ایک یا چند باتوں میں مواقفت پائے جانے ہی پر الزام کی بنیاد ہے، تو دنیا میں کوئی مذہب بھی اس الزام سے بری نہیں ہو سکتا، دنیا میں کوئی داعی مذہب ایسا نہیں گزرا ہے، جس کی کوئی نہ کوئی بات کسی سابق داعی مذہب کی بات کے موافق نہ ہو بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام کی تو اکثر تعلیمات اگلے داعی مذہب کی تعلیمات کے حرف بحرف مطابق ہیں۔

قرآن پہلی آسمانی کتابوں کا مصدق ہے

اس کو بھی جانے دیجئے اور مجھے یہ بتائیے کہ اگر آپ کے ترک وانکار حدیث کی یہی بنیاد ہے، تو آپ قرآن کریم پر کیسے ایمان لاسکتے ہیں، آخر قرآن بھی تو خود کو اگلی کتابوں کا مصدق بتاتا ہے، تو کیا قرآن کی تصدیق وموافقت سے مخالفین کا الزام قوی نہ ہوگا، اگر نہیں تو کیوں؟ اور اگر ہوگا تو آپ کا نزلہ حدیثوں ہی پر کیوں گرتا ہے۔

پھر اگر آپ کو مخالفین کے الزام ہی کا دفعیہ منظور تھا، تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ آپ مطلقاً ساری حدیثوں کا انکار کر کے بخیال خویش اس جوابدہی سے سبکدوش ہو جاتے، بلکہ صرف یہ فرما دیتے جب بھی سبکدوشی حاصل ہو جاتی کہ حدیث زیر بحث میں یہ واقعہ جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہ صحت سے عاری ہیں، کسی راوی سے بھول ہوگئی ہے، اس لئے اس نے اصل واقعہ کی صورت بدل دی، اصل واقعہ یوں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عذاب قبر کا علم نہ تھا جب یہودی عورت سے اس کا ذکر سنا تو ان کو تعجب ہوا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ عذاب قبر حق ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس سوال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ اس مسئلہ سے ابھی لوگ واقف نہیں ہوئے ہیں اس لئے آپ نے نمازوں میں عذاب قبر سے پناہ مانگنا شروع کیا، تا کہ اس مسئلہ سے سب لوگ آگاہ ہو جائیں۔

معترض کی ناسمجھی

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حدیث مذکور میں کسی آیت کا حوالہ نہیں دیا ہے، شاید ''حق گو'' صاحب کو وحی کے لفظ سے دھوکا ہوا، اگر ایسا ہے تو یہ ان کی ناواقفیت ہے، بات یہ ہے کہ حق گو صاحب وحی کو قرآن میں منحصر سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

وحی غیر متلو کی حقیقت

قرآن کے علاوہ بھی ایک وحی ہے جس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی آتی تھی، اس کی دو قسمیں تھیں ایک وہ جس کے معنی کے ساتھ الفاظ بھی منجانب اللہ نازل ہوتے تھے اس کو حضور بعینہٖ انہی الفاظ میں لوگوں کو سناتے تھے اسی کو قرآن اور کتاب اللہ کہتے ہیں دوسری وہ جس کے صرف معنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں القاء ہوتے تھے اور اس کو اپنے الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم

بیان کرتے تھے، اسی کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔

اس کا ثبوت قرآن مجید سے

اس کا ثبوت خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ ارشاد ہے۔

﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ﴾

تَرجَمہ: ''(یعنی) ہم نے آپ پر کتاب نازل کی تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے ذریعہ فیصلہ کریں جو اللہ آپ کو سوجھائے اور سمجھائے۔''

اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر ہے ایک ''کتاب'' وہ تو وحی متلو ہے، دوسری وہ بات جو خدا تعالیٰ اپنے نبی کو سوجھائے اور سمجھائے، یعنی آپ کے قلب میں جو علوم و حکم و اسرار القاء فرمائے، یہ وحی غیر متلو ہے۔

''حق گو'' کی عقلمندی کا نمونہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث زیر بحث میں جس وحی کا ذکر ہے وہ یہی وحی غیر متلو ہے، لہٰذا اس کو قرآن میں تلاش کرنا ''حق گو'' صاحب کی عقل مندی ہے ''حق گو'' صاحب کا اس ناواقفیت پر ہم کو بڑا افسوس ہے، اگر انہوں نے سرسری نظر سے بھی قرآن پڑھا ہوتا، تو ان کو معلوم ہوتا کہ دل میں کوئی بات ڈال دینے کے لئے لفظ وحی کا اطلاق بکثرت قرآن مجید میں ہوا ہے ① (مثلاً) ''واوحی ربك الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا'' یعنی ہم نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی کہ بنا تو پہاڑوں میں گھر ② ''واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیه'' یعنی ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں ڈالا کہ تو اس کو دودھ پلا ③ ''یوحی بعضهم الی بعض زخرف القول غرورا۔'' یعنی ان کا بعض بعض کے دل

میں ڈالتا ہے ملمع بات فریب کاری کی رو سے کیا ''حق گو'' صاحب ان آیتوں میں وحی کا لفظ دیکھ کر اس جستجو میں مصروف ہو جائیں گے کہ شہد کی مکھیوں پر کون سا قرآن نازل ہوا تھا اور مادر موسیٰ علیہ السلام پر کونسی کتاب الٰہی نازل ہوئی تھی۔

عذاب قبر کا ثبوت قرآن مجید سے

تیسری بات کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ کی صریح غلط بیانی ہے، قرآن مجید میں عذاب قبر کے خلاف ایک لفظ بھی کہیں نہیں، بلکہ اس کے برخلاف قرآن مجید کی متعدد آیات عذاب قبر کی مثبت ہیں مثلاً

① "وحاق بآل فرعون سوء الْعَذَاب النَّار يَعْرِضُون عَلَيها غدُوًّا وعشيًّا ويوم تقوم السَّاعة ادخلوا آل فرعون اشد العذاب" یعنی آل فرعون پر بڑا عذاب نازل ہو گیا، وہ آگ جس پر وہ صبح وشام پیش کیے جاتے ہیں، اور جس دن قیامت برپا ہوگی تو حکم ہوگا کہ آل فرعون کو سخت عذاب میں ڈالو، اس آیت میں آل فرعون کی ہلاکت کے بعد اور قیامت سے پہلے ان کے عذاب دیئے جانے کا صراحۃً ذکر موجود ہے، اور عذاب قبر کا یہی مطلب ہے کہ موت کے بعد اور قیامت سے پہلے جس کو برزخ کہتے ہیں مردوں پر عذاب ہوتا ہے۔

② "ولو ترى اذ يتوفى الذين كفروا الملئكة يضربون وجوههم وادبارهم وذوقوا عذاب الحريق" (یعنی) کاش تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی جان نکالتے ہیں درآنحالیکہ ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں چکھو جلنے کا مزا، اس آیت سے بلا کسی تاویل کے واضح ہے کہ موت ہی کے وقت سے کافروں کا عذاب شروع ہو جاتا ہے۔

③ "مِمَّا خَطِيئٰتهم اغرقوا فادخلوا نارًا" یعنی قوم نوح اپنے گناہوں کے سبب ڈبو دی گئی پس آگ میں ڈالی گئی، یہ آیت بآواز بلند پکار رہی ہے کہ نوح علیہ السلام

کی قوم غرق آب ہوتے ہی مبتلائے عذاب ہوگئی، حالانکہ قیامت ابھی تک نہیں آئی ہے، یہ عذاب قبر یعنی عذاب برزخ نہیں تو کیا ہے۔

عذاب قبر کے خلاف قرآن میں ایک لفظ بھی نہیں

یہ تین آیتیں نمونہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں، اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں، اور ہمارا دعویٰ ہے کہ قرآن میں اس کے خلاف ایک حرف بھی نہیں ہے "حق گو" صاحب یا ان کے اعوان وانصار میں جرأت ہو تو ایک ہی آیت پیش کر کے اپنی صداقت کا ثبوت دیں۔

"حق گو" کا بے ثبوت دعویٰ

چوتھی بات کا جواب یہ ہے کہ "حق گو" صاحب کا یہ دعویٰ کسی طرح قابل سماعت ولائق اعتبار نہیں ہے، جب کہ انہوں نے اپنے اس دعویٰ پر کہ "یہودی منکر عذاب برزخ ہیں" کوئی شہادت علمائے یہود کی پیش نہیں کی اگر "حق گو" صاحب میں کچھ بھی صداقت ہو تو، عہد نبوی ﷺ کے علمائے یہود یا توریت کی شہادت سے عذابِ برزخ کی نفی ثابت کریں۔

"حق گو" کی نقل کردہ دوسری حدیث

"حق گو" صاحب نے عنوان بالا کے ثبوت میں دوسری حدیث یہ ذکر کی ہے:

> "مروان نے اپنے دربان رافع سے کہا کہ ابن عباس کے پاس جا، اور کہہ کہ اگر ہم میں سے ہر اس آدمی کو عذاب ہو جو اپنے کئے پر خوش ہوتا ہے، اور چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں، اس بات پر جو اس نے نہیں کی، تو ہم سب کو عذاب ہوگا ابن عباس نے کہا تم کو اس آیت سے کیا تعلق، پھر ابن عباس نے یہ آیت پڑھی "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ میثاق

الَّذِیْنَ اُوْتوا الکتابَ لِتبیننہ للنّاسِ ولا تکتمونہ" پھر اس آیت کو پڑھا "لا تحسبن الذین یفرحون بما اتوا" ابن عباس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب سے کوئی بات پوچھی انہوں نے اس کو چھپایا، اور اس کے بدلے انہوں نے دوسری بات بتائی اس حال میں کہ آپ کو یہ سمجھا دیا کہ ہم نے آپ کو وہ بات جو آپ نے پوچھی تھی بتا دی، اور اپنی تعریف کے خواست گار ہوئے، اور اپنے کئے پر خوش ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کو فرمایا ہے، کہ عذاب دے گا، اور (آیت میں وہی) اہل کتاب مراد ہیں۔"

"حق گو" کے مدعائے باطل سے حدیث مذکور کی بے تعلقی

یہ حدیث "حق گو" صاحب کے مدعا سے اور بھی زیادہ بے تعلق ہے ہم کو تو سخت حیرت ہے کہ "حق گو" صاحب نے عنوان مذکور کے ثبوت میں اس حدیث کو پیش کر کے عقلاء کی مجلس میں اپنا مضحکہ کیوں کرایا، کیا کسی غیر مذہب والے سے علمی مذاکرہ کرنا، کسی مسئلہ میں ان کا عقیدہ یا مسلک دریافت کرنا صرف اس لئے ہوتا ہے کہ اس کو معلوم کر کے بطور سرقہ وانتحال کے اپنا مذہب وعقیدہ بنا لیا جائے یا معاذ اللہ اس کو وحی الٰہی بنا کر پیش کر دیا جائے پھر حدیث میں تو یہ بھی مذکور نہیں ہے کہ آپ نے یہود سے کوئی مسئلہ پوچھا تھا پھر آپ نے یہ کیسے خیال کر لیا کہ آپ نے ان سے کوئی مسئلہ پوچھا ہوگا، یہ بھی تو ہو سکتا ہے بلکہ اغلب یہی ہے کہ آپ نے ان سے یہ دریافت کیا ہوگا کہ میری پیشین گوئی تمہاری کتابوں میں ہے یا نہیں، اور اس سوال کا منشاء صرف ان کی صداقت کا امتحان کرنا تھا۔

حدیث مذکور میں مشرکین اور نصاریٰ کا رد

اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس حدیث سے مشرکین و نصاریٰ کے اعترض مذکور کا

نہایت بلیغ رد ہوتا ہے تقریر اس کی یہ ہے کہ یہود سے آنحضرت ﷺ نے کوئی بات پوچھی، اور یہود نے صحیح جواب کے بجائے غلط جواب دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہود کے فعل کی مذمت فرمائی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ مبعوث ومرسل من اللہ نہ ہوتے، بلکہ یہود ونصاریٰ کی سنی سنائی باتوں کو وحی بنا کر پیش کرتے ہوتے، تو یہود کے اس غلط جواب کو بھی وحی کی صورت میں پیش کر دیتے، حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ آپ نے اس کا غلط وخلاف واقع ہونا ظاہر فرمایا، لہٰذا معلوم ہوا کہ آپ کو یہود ونصاریٰ کی باتوں پر قطعاً اعتماد نہیں تھا، اور نہ ان کی باتوں کو وحی بنا کر پیش کرتے تھے بلکہ آپ کا اعتماد صرف وحی الٰہی پر تھا اور آپ کی تعلیمات کا مدار صرف وہ چیز تھی جس کو خدا آپ پر القاء کرتا تھا۔

”حق گو“ اور اس کے ہم اعتقاد دوگونہ عذاب میں

پھر حق گو صاحب سے ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کے خیال میں تو حدیث کی اشاعت عباسیوں کے زمانہ میں ہوئی ہے (صفحہ ۴) لہٰذا مشرکین عہد نبوت کے الزام کی بنیاد حدیثوں پر تو ہو نہیں سکتی، کوئی اور چیز ہوگی جس پر اس الزام کی بنیاد مشرکین نے قائم کی ہوگی، مجھے اس بنیاد کی تعیین کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ چاہے جو بنیاد بھی ہو، دو حال سے خالی نہیں ہے، ایک یہ کہ وہ بنیاد صحیح ہو (معاذ اللہ) اس صورت میں حدیثوں کا انکار محض حماقت ہوگا، اس لئے کہ حدیثیں اصل بنیاد الزام تو ہیں نہیں کہ ان کے انکار سے اصل بنیاد الزام بیخ وبن سے اکھڑ جائے پس کہاں کی عقل مندی ہے کہ حدیثوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور الزام بھی دفع نہ ہوا، اور اگر وہ بنیاد غلط ہو (اور واقعہ بھی یہی ہے بلکہ الزام کی درحقیقت کوئی بنیاد نہیں ہے) تو بھی انکار حدیث خالی از حماقت نہیں، اس لئے کہ اصل بنیاد کا قلع قمع ہو جانے سے جب مشرکین کا دعویٰ ہباءً منثوراً ہو چکا تو اب تائید وشہادت کو معرض بحث قرار دینا اور

اس کے ردوقبول کے درپے ہونا کھلی ہوئی بے عقلی ہے۔

مخالفین کے اعتراضات کی بنیاد صرف بغض وعناد پر ہے

حق گو صاحب دراصل عقل سے ذرا کم کام لیتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ مخالفین سلام کے اعتراضات حدیثوں سے پیدا ہوتے ہیں حالانکہ یہ محض فریب ہے مخالفین اسلام کے اعترضات تو صرف عناد وبغض اور عداوت سے پیدا ہوتے ہیں اگر حدیثوں سے پیدا ہوتے تو اس زمانہ میں اعتراض کیوں پیدا ہوتا کیا آپ کو قرآن مجید میں یہ آیات نہیں ملیں۔

﴿وقال الذین کفروا ان ھذا الا افكٌ افتراہ واعانه علیه قومٌ آخرون فَقَدْ جَاءُ واظلمًا وزُورًا وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی عَلَیْه بکرۃ واصیلا۔﴾

یعنی کافروں نے کہا کہ یہ قرآن تو بس جھوٹ ہے جس کو نبی عربی نے بنالیا ہے، اور دوسروں نے اس افتراء میں ان کی مدد کی ہے (خدا کہتا ہے کہ) کافروں کا یہ سراسر ظلم اور صریح جھوٹ ہے کافروں نے یہ بھی کہا کہ یہ تو پہلوں کے افسانے ہیں جن کو محمد (ﷺ) نے لکھ لیا ہے پس وہ افسانے صبح وشام ان پر املاء کئے جاتے ہیں (اور وہ ان کو لکھتے رہتے ہیں)۔

دیکھئے ان آیات میں اس زمانے کا اعتراض مذکور ہے جب بخیال ''حق گو'' صاحب حدیثیں تھیں ہی نہیں۔

انکار حدیث کے بعد بھی معترضین کا منہ بند نہیں ہوسکتا

اسی سے ''حق گو'' صاحب کی ایک اور غلط کاری ظاہر ہوگئی وہ یہ کہ انہوں نے مخالفین کے الزامات کو رفع کرنے کے لئے انکار حدیث کی جو راہ نکالی ہے وہ بالکل غلط اور بے نتیجہ ہے اس لئے کہ حدیثوں کو بے اعتبار کرنے کے بعد بھی مخالفین کے

اعتراضات بند نہیں ہو سکتے آخر جب حدیثیں نہیں تھیں تو مخالفین نے اعتراضات کس طرح کئے اسی طرح حدیثوں کے انکار کے بعد کرتے رہیں گے۔

حدیث مذکور کو غلط کہنے کی دوسری وجہ اور اس کا جواب

''حق گو'' صاحب نے اس حدیث کے غلط ہونے کی دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ اس کے مخالف ایک دوسری روایت بھی آئی ہے، حالانکہ کوئی روایت مذکورہ بالا حدیث کی مخالفت میں وارد نہیں ہوئی، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیت:

﴿لا تحسَبَنَّ الذین یَفْرَحُون الآیة.﴾

کا ایک دوسرا شان نزول جو مروی ہے وہ مذکورہ بالا شان نزول کے مخالف نہیں ہے، بلکہ صورت یہ ہوئی ہے کہ دونوں واقعے یکے بعد دیگرے اتفاق سے پیش آئے، اور چونکہ دونوں واقعوں میں اپنی بے جا تعریف کی خواہش منافقین و یہود نے ظاہر کی تھی، اس لئے آیت دونوں پر برابر چسپاں تھی، پس جب آیت کا تعلق دونوں واقعوں سے تھا، تو اگر ایک صحابی نے یہود کے واقعہ کو اور دوسرے نے منافقین کے قصہ کو شان نزول آیت قرار دیا تو اس میں کوئی تعارض و تصادم اور تخالف نہیں ہے۔

تیسری وجہ اور اس کی تغلیط

''حق گو'' صاحب نے اس حدیث کے غلط ہونے کی تیسری وجہ یہ بیان کی ہے کہ:

> ''ابن عباس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بالکل کمسن بچے تھے لہذا مروان ان سے یہ کیسے دریافت کر سکتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں کیا سنا ہے۔''

''حق گو صاحب کی یہ تیسری وجہ ان کے مبلغ علم کی صاف پردہ دری کر رہی

ہے، اولاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما عہد نبوی میں بالکل کمسن بچے نہ تھے، بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا خود بیان ہے کہ وہ عہد نبوی ﷺ میں قریب بہ بلوغ تھے۔[1] اور مورخین نے تصریح کی ہے کہ وہ وفات نبوی ﷺ کے وقت ۱۳ سال کے تھے نبی ﷺ کے ارشادات سننے اور سمجھنے کے لئے یہ بہت کافی سن ہے بالخصوص شریف گھرانوں اور عمدہ تربیت کے لڑکے تو اس سن میں بہت ذہین و ہوشیار ہو جاتے ہیں، لہٰذا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا آنحضرت ﷺ کی حدیثوں کو خود حضور علیہ السلام کی زبان فیض ترجمان سے سننا نہ مستبعد ہے نہ محل تعجب، ثانیاً روایت میں یہ ذکر بھی نہیں ہے کہ اے رافع! ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ پوچھنا کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس آیت کے بارے میں کیا سنا ہے۔ روایت میں تو صرف اتنا ہے کہ اے رافع! ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کے پاس جا کر ہمارا یہ اشکال پیش کر دے، معلوم ہوتا ہے کہ ”حق گو“ صاحب اپنا لکھا ہوا بھی نہیں سمجھتے۔

پھر حق گو صاحب نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بالکل کم سن ثابت کرنے کے لئے یہ لکھا کہ:

> ”ان کو آنحضرت (ﷺ) نے اس وقت جب کہ وہ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، معاویہ کے پاس بھیجا، اور معاویہ فتح مکہ کے بعد مسلمانوں میں شامل ہوئے، لہٰذا معلوم ہوا کہ وہ فتح مکہ تک بالکل بچے تھے۔“

لیکن ”حق گو“ صاحب کی یہ ساری قیاس آرائیاں غلط ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فتح مکہ کے سال گیارہ برس کے تھے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بے شک فتح کے بعد مسلمانوں میں شامل ہوئے لیکن جس روایت میں ان کے بلانے کا ذکر ہے، اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو مسلمان ہونے کے بعد بلایا، اور

---

[1] بخاری: ۱/۷۱

جب یہ تصریح نہیں ہے تو ہوسکتا ہے کہ قبل اسلام آنحضرت ﷺ نے ان کو بلایا ہو، اور اس وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایسے کمسن ہوں کہ بچوں کے ساتھ ساتھ کھیلتے رہے ہوں، ''حق گو'' صاحب بتائیں کہ انہوں نے کس دلیل سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بلانے کے واقعہ کو فتح مکہ کے بعد مانا ہے۔

''حق گو'' کی تاریخ سے افسوسناک بے خبری

''حق گو'' صاحب نے اسی بحث میں اپنی بے نظیر ''تاریخ دانی'' کا ثبوت بھی دیا ہے، فرماتے ہیں کہ:

> ''آنحضرت ﷺ نے حضرت میمونہ سے فتح مکہ کے بعد نکاح کیا ہے۔''

حالانکہ اب تک سارے مورخین ومحدثین یہی جانتے تھے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے سفر میں نکاح ہوا ہے۔[1]

''حق گو'' صاحب کا ایک اور لطیفہ بھی ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:

> ''راوی نے ابن عباس کو جو بدنام کیا، اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی بجز اس کے کہ حدیث کی اشاعت عباسیوں کے عہد میں ہوئی اور ابن عباس کا نام اپنے ساتھ بہت سی دنیوی برکات اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا۔''

لیکن ''حق گو'' صاحب نے اس کی کوئی توجیہ نہ کی کہ راوی نے عباسیوں کے دشمن مروان اموی کا نام لیا، آخر مروان نام پر عباسیوں سے کس نفع کی توقع تھی، اور ''حق گو'' صاحب نے اس کا بھی کچھ لحاظ نہ کیا کہ وہ خود (صفحہ ۲۳) میں لکھتے ہیں کہ ابن شہاب زہری نے بھی حدیث کی ایک کتاب لکھی ہے اور ابن شہاب کا زمانہ عباسیوں سے پہلے ہے پھر ان کا یہ فرمانا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ عباسیوں کے عہد میں

---

[1] بخاری: ۲/۶۱۱ بروایت ابن اسحق، وزرقانی: ۲/۲۶۲، ۳/۲۵۰، زاد المعاد: ۴/۲۵۷

حدیث کی اشاعت ہوئی۔

حق گو صاحب نے دوسرا عنوان یوں قائم کیا ہے:

آنخضرت ﷺ کی خواہشات نفسانی کے لئے خدا وحی اتارا کرتا ہے اور اس کے ثبوت میں یہ حدیث ذکر کی ہے۔

> ”حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ یہ عورت شرم نہیں کرتی ہے جو اپنے تئیں بخش دیتی ہے، آنخضرت پر یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری ”ترجی من تشاء منھن الخ“ تب میں نے کہا آپ کا رب آپ کی خواہشات نفسانی کے مطابق (وحی اتارنے میں) جلدی کرتا ہے۔“

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ:

> ”یہ کسی زندیق کا قول ہے جو بیک وقت آنخضرت ﷺ ہی پر نہیں بلکہ خدائے قدوس پر بھی حملے کر رہا ہے، قرآن میں یہ آیت آپ کی منکوحہ بیویوں کے بارے میں ہے، سیرۃ حلبی والے نے غالباً اسی روایت سے متاثر ہو کر یہ کہہ دیا، کہ آپ پر بلا شرط نکاح عورتیں حلال کی گئی تھیں۔“

ہویٰ کے معنی

”حق گو“ صاحب میں بڑا عیب یہ ہے کہ احادیث کی خود اپنے جی سے ایک غلط تشریح کرتے ہیں پھر اسی تشریح کی بنیاد پر حدیثوں کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حدیث مذکورہ بالا میں ایک لفظ ”ھوی“ کا واقع ہے، اس کا ترجمہ ”حق گو“ صاحب نے خواہشات نفسانی کر کے ایک بے ہودہ الزام قائم کر دیا، حالانکہ صحیح ترجمہ[1] ہوی کا رضا اور پسند ہے، اور اس فقرہ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ آنخضرت ﷺ کی مرغوب و پسندیدہ چیز کی اجازت دینے میں اللہ تعالیٰ دیر نہیں کرتا، اور یہ مفہوم خود

---

[1] جیسا کہ خود راوی حدیث نے ہوی کی تفسیر رضا سے کر دی ہے۔ مسند احمد

قرآن کریم سے ثابت ہے "ولسوف یعطیك ربك فترضی" یعنی "البتہ بہت جلد اللہ تعالیٰ آپ کو دے گا (جو آپ چاہیں گے) پس آپ خوش اور راضی ہو جائیں گے۔" دیکھئے یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ خدا آپ کے مرغوبات آپ کو ضرور عطا کرے گا، اور آپ کی خوشی ضرور پوری کرے گا، اور اسی مضمون کو حدیث میں بھی بیان کیا گیا ہے، اب اگر "حق گو" صاحب یہ کہیں کہ ہوی کا صحیح ترجمہ خواہشات نفسانی ہی ہے تو میں کہوں گا کہ اس مقام پر ہوی کا یہ ترجمہ کرنا انتہائی بدبختی زندیقیت اور دشمنی واہانت رسول اللہ ﷺ ہے اگر "حق گو" صاحب کے دل میں مرتبہ رسالت کی عظمت اور انبیاء کی معصومیت ونزاہت کا احساس ہوتا، تو وہ ہرگز اس کی جرأت نہ کرتے کہ اپنے جیسے گناہوں میں ملوث انسانوں پر انبیاء کو قیاس کر کے ان کے لئے نفسانی خواہشات ثابت کرتے، ہم یہ مان سکتے ہیں کہ لغت میں ہوی کے معنی مطلق خواہش کے ہیں، لیکن اس کے ساتھ نفسانی کا اضافہ غلط ہے اور خواہش کا نفسانی ہونا ہوی کے مفہوم کا جزو نہیں ہے، لہٰذا اگر کسی مقام میں محل وقوع کی مناسبت سے ہوی کے معنی خواہش نفسانی کر دیا گیا ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جہاں اس کا موقع نہ ہو وہاں بھی یہی ترجمہ کر دیا جائے "حق گو" صاحب کو یہ سوچنا چاہئے تھا کہ یہاں ہوی کا لفظ رسول اللہ ﷺ کے لئے بولا گیا ہے، اور رسول نفسانی خواہشوں سے منزہ ومعصوم ہوتا ہے لہٰذا اس لفظ کا ترجمہ نفسانی خواہش کرنا صرف غلط ہی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی عصمت پر حملہ بھی ہوگا، کیا "حق گو" صاحب نہیں جانتے کہ مکر اور خداع کے الفاظ ہمارے محاورہ میں کیسے مکروہ معنی میں بولے جاتے ہیں، اور ان دونوں کو کفار ومنافقین کی مذمت کے سلسلہ میں قرآن نے استعمال کیا ہے پھر ان ہی الفاظ کا اطلاق قرآن میں خدا کے لئے بھی ہوا ہے۔ تو کیا "حق گو" صاحب یہاں بھی ان الفاظ کا وہی ترجمہ کریں گے جو کفار ومنافقین کے ذکر میں کیا جاتا ہے "حق گو" صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہوی کا لفظ عربی لٹریچر میں محبوب

ومرغوب شے کے لئے برابر بولا جاتا ہے ایک شاعر کہتا ہے

هوای مع الركب اليمانين مصعد
جنيب و جثمانی بمكة موثق

(میرا محبوب یمنی قافلہ کے ساتھ چلا جا رہا ہے اور میرا جسم مکہ میں مقید و اسیر ہے)۔

اب میں چاہتا ہوں کہ حدیث مذکورہ اور اس میں جس آیت کی طرف اشارہ ہے، اس کی بھی مختصر سی تشریح کر دوں تا کہ ''حق گو'' صاحب کی غلط فہمی اور ابلہ فریبی اچھی طرح کھل جائے۔

حدیث زیر بحث اور آیت مذکورہ کی تشریح

حدیث و سیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض عورتیں زوجیت رسول ﷺ کا شرف حاصل کرنے کے لئے بغیر اس کے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے اس کی کوئی تحریک یا خواہش کا اظہار ہو، خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرتی تھیں کہ ''وهبت نفسی لك يا رسول الله'' (میں نے اپنے تئیں آپ کے لئے بخش دیا) عورتوں کی اس بات پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو محض فطری حیا و غیرت کی بنا پر تعجب ہوا کہ ایک عورت فطرۃً خواہش زوجیت کے اظہار میں بے باک نہیں ہوا کرتی پھر ان عورتوں کو کیسے ہمت ہوتی ہے۔ کیا ان کو شرم نہیں لگتی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا برابر اس پر متعجب رہا کرتی تھیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب کی ایک آیت میں ارشاد فرمایا کہ جو عورت اپنے نفس کو نبی کے لئے ہبہ کر دے، اس کو بھی ہم نے نبی کے لئے حلال کیا، بشرطیکہ نبی اس کو رکھنا چاہے، تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا تعجب جاتا رہا، اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اگر یہ چیز شرعاً قابل حیا و شرم ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان عورتوں کو نبی کے لئے حلال کرنے کے بجائے ان کے فعل کی مذمت کرتا، پھر اسی

آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اختیار بھی عطا فرمایا، کہ آپ اپنی بیبیوں میں سے جن کو چاہیں چھوڑ دیں یا ان کے لئے باری مقرر نہ کریں، اور جن کو چاہیں اپنے سے ملالیں، آپ کی جو مرضی ہو کریں، اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں دیکھتی ہوں کہ خدا تعالیٰ آپ کی جو مرضی ہوتی ہے اس کے پورا کرنے میں دیر نہیں کرتا، ایک اسی کو دیکھئے کہ ساری بی بیوں کو رکھنے یا ان سب کے لئے باری مقرر کرنے کو ضروری قرار دیا جاتا تو ممکن تھا کہ حضور ﷺ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف یا طبیعت پر گرانی ہوتی اس لئے اس معاملہ میں پورا پورا اختیار آپ کو دے دیا کہ آپ کی جو خوشی ہو کیجئے، حدیث مذکور کی سیدھی اور صاف تشریح یہ تھی کہ جس کو "حق گو" صاحب اپنی حدیث دشمنی کی وجہ سے نہ سمجھ سکے، اور خواہ مخواہ راوی حدیث پر برس پڑے، اب اس کے بعد آیت کو ملاحظہ کیجئے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۤ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ تُرْجِيْ مَنْ تَشَاۗءُ مِنْهُنَّ وَتُــــْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۭ﴾ [1]

ترجمہ: "یعنی اے نبی (ﷺ) ہم نے آپ کے لئے یہ بیبیاں جن کو آپ ان کے مہر دے چکے ہیں حلال کی ہیں اور وہ عورتیں بھی جو آپ کی

---

[1] احزاب: آیة ۵۰، ۵۱

> مملوکہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو غنیمت میں دلوا دی ہیں اور آپ کے چچا کی بیٹیاں، اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں، اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں، اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں، جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو، اور اس مسلمان عورت کو بھی جو اپنے تئیں پیغمبر کے لئے بخش دے بشرطیکہ اس کو نکاح میں لانا چاہیں یہ آپ کے لئے مخصوص ہے، نہ اور مؤمنوں کے لئے (اور مؤمنوں کے لئے دوسرے کچھ احکام ہیں) ہم کو وہ احکام معلوم ہیں جو ہم نے ان پر ان کی بیبیوں اور لونڈیوں کے بارے میں مقرر کئے ہیں، اور ہم نے مذکورہ بالا حکم کو صرف آپ کے لئے اس واسطے نافذ کیا) تاکہ آپ کو کسی قسم کی تنگی نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، ان (بیبیوں) میں سے آپ جس کو چاہیں اپنے سے دور رکھیں اور جس کو چاہیں اپنے نزدیک کرلیں، اور جن کو دور رکھا تھا ان میں سے پھر کسی کو طلب کریں تب بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔“

اس آیت میں صراحۃً مذکور ہے کہ کوئی عورت خود اپنی ذات کو آنحضرت ﷺ کے لئے ہبہ کر دے تو وہ عورت بھی آپ کے لئے حلال ہے بشرطیکہ آپ اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں، اور یہ بھی تصریح ہے کہ یہ صورت آپ کے ساتھ مخصوص ہے، پس لازمی طور پر آیت کے اس جز کا یہی مطلب ہوگا کہ کوئی عورت خود کو بلا مہر و بلا عوض رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں دے دے اور یہ کہہ دے کہ میں نے اپنے آپ کو آپ کے لئے بخش دیا، اور آپ اس ہبہ کو قبول کرلیں تو یہ بھی نکاح کی ایک صورت ہے، اور وہ عورت رسول اللہ ﷺ کے لئے حلال ہو جائے گی، اور اس کا مہر حضور ﷺ کے ذمہ لازم نہ ہوگا، اور یہ صورت بجز آنحضرت ﷺ کے اور کسی کے لئے جائز نہیں، جو صاحب اس کے علاوہ کوئی اور مطلب نکالنا چاہیں وہ آیت کے دو لفظوں پر خصوصیت کے ساتھ غور کریں، اس کے بعد جو مطلب چاہیں بیان کریں

ایک "وھبت نفسھا" جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کو بلا عوض آنحضرت ﷺ کے لئے بخش دے، اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہبہ مفت دینے اور بخشنے کو کہتے ہیں۔ دوسرے "خالصة لك من دون المؤمنين" یعنی یہ صورت خالص طور پر آپ کے لئے مشروع ہے، اور مسلمانوں کے لئے نہیں، لہٰذا جو مطلب بیان کیا جائے وہ ایسا ہو کہ دوسرے مسلمانوں کے لئے وہ جائز نہ ہو۔

پھر آیت میں یہ تصریح بھی موجود ہے، کہ یہ صورت نبی ﷺ کے لئے خاص اس لئے کی گئی تاکہ آپ کو کسی قسم کی تنگی نہ ہو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس حکم کی مشروعیت آنحضرت ﷺ سے تنگی دفع کرنے کے لئے اور اس لئے ہے کہ آپ رنجیدہ نہ ہوں بلکہ آپ خوش رہیں اب انصاف سے بتائیں کہ حدیث مذکور میں قرآن مجید سے زائد بات کیا بیان کی گئی ہے۔

اس کے بعد میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں، کہ اس آیت میں جو اختیارات آنحضرت ﷺ کو عطا فرمائے گئے ہیں، ان کی نسبت قرآن مجید کی مدد سے کوئی شخص نہیں بتا سکتا کہ آپ نے ان سے کوئی فائدہ اٹھایا یا نہیں، ہاں حدیث بتاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ بالا قسم کی کسی عورت کو اپنی زوجیت میں قبول نہیں فرمایا۔[1] اسی طرح آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات میں سے کسی کو علیحدہ نہیں کیا، نہ کسی کی باری بند کی نہ کسی کی باری کم کی یا زیادہ کی، خالص مساوات کے اصول پر سب کی باریاں مقرر رہنے دیں۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہ اختیارات حاصل کرنے کی خواہش نہ تھی، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اختیارات حاصل ہونے کے بعد ان سے فائدہ نہ اٹھاتے، اور یہیں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حدیث مذکور میں ہوی کا ترجمہ خواہشات نفسانی کرنا خلاف واقع ہونے کے علاوہ سخت بدباطنی

---

[1] فتح الباری: ۳۷۲/۸ بروایت ابن عباس

[2] فتح الباری بروایت زھری و قتادہ: ۳۷۳/۸

اور خبث طینت کی دلیل ہے اس لئے کہ یہاں تو حضور علیہ الصلاۃ والسلام کو کوئی خواہش تھی ہی نہیں۔

صاحب سیرۃ حلبی پر افتراء

چلتے چلتے ''حق گو'' صاحب سیرۃ حلبی پر بھی ایک افتراء کر گئے سیرۃ حلبی میں آنحضرت ﷺ کی خصوصیات میں بلا نکاح عورتوں کا حلال ہونا کہیں بھی مذکور نہیں ہے، ہاں بلفظ ہبہ نکاح کا منعقد ہونا اور مہر کا واجب الاداء نہ ہونا البتہ خصوصیات رسول اللہ ﷺ میں مذکور ہے، اور یہ خصوصیات قرآن سے ثابت ہے۔

''حق گو'' نے تیسرا عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ مسحور کئے جاتے ہیں

اور اس کے ثبوت میں آنحضرت ﷺ کے مسحور ہونے کا واقعہ صحاح سے نقل کیا ہے لیکن اس سے پہلے آپ نے ایک تمہید لکھی ہے جس میں اپنی قرآن دانی کے لئے ایسے موتی لٹائے ہیں جن سے اپنے ناظرین کے جیب و دامن کو محروم رکھنا میں پسند نہیں کرتا، فرماتے ہیں:

> ''قرآن شریف کی سب سے آخر میں جو سورتیں ہیں، اور جو ان سے ماقابل ہیں، وہ بالکل تاریخی ترتیب سے لگی ہوئی ہیں (مگر ترتیب الٹی ہے) اوّل بہت چھوٹی چھوٹی مختصر سورتیں ہیں، جیسے مبتدی کو پہلے چھوٹے چھوٹے پھر طولانی عبارتیں سکھائی جاتی ہیں، خدائے تعالیٰ نے اس اصول فطرت کی بنا پر اپنے برگزیدہ نبی پر وحی نازل کی ہے اب دیکھو ان سورتوں کے معنی سے کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔
>
> ایک جویائے حق تنہا بے آب ودانہ (جس کی یادگار میں ہم ہر سال ان دنوں میں روزہ رکھتے ہیں) غار حرا میں بیٹھا کائنات کے وجود اور

راز فطرت کے سمجھنے کے لئے مراقبہ کر رہا ہے تاریکی وسناٹے میں ایک ایک قسم کا خوف دل میں سما جاتا ہے، کہ وحی کی آواز آتی ہے ”قل اعوذ برب الفلق“ پھر ”قل اعوذ برب الناس“ آنحضرت کا قلب اس سے مطمئن ہوتا ہے، اور یکسوئی حاصل ہوتی ہے تو ”قل ھو اللّٰہ احد“ کی آیت اس راز کا انکشاف کرتی ہے جس کے لئے وہ پریشان وسرگردان تھا آپ کمر بستہ ہوکر اٹھتے ہی اپنی قوم کو دعوت دیتے ہیں، بوڑھا بد بخت چچا آپ کا مذاق اڑاتا ہے، آپ دل گرفتہ ہوکر پھر غار حرا کا رخ کرتے ہیں، وحی الٰہی آپ کو تسکین دیتی ہے ”تبت یدا ابی لھب الآیۃ“ آپ قوی دل ہوکر پھر قوم کے پاس آتے ہیں، اور فرمان الٰہی کو ”قل یا ایھا الکافرون“ کے الفاظ میں سناتے ہیں، اور ان سے ترک موالات کا اعلان کرتے ہیں کفار کی طرف سے آپ کو ایذائیں دی جاتی ہیں آپ پھر بے دل ہوتے ہیں، وحی آپ کو آئندہ فتوحات کا نقشہ دکھلاتی ہے ”اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح الخ۔“

”حق گو“ کے شاعرانہ تخیلات

”حق گو“ کے ان عجیب وغریب تخیلات کی داد دیئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے تھے، اگر کاش انہوں نے یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ ان کے ان تخیلات کا ماخذ کیا ہے، اور ان کے لئے وہ کون سا ثبوت اپنے پاس رکھتے ہیں۔

اگر حق گو کے پاس کوئی ثبوت و ماخذ نہیں ہے، صرف ان کے تخیلات ہیں تو وہ بتائیں کہ ان کے تخیلات میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ مسلمان اسی کو قبول کریں اور جو لوگ علم وعقل، فہم وذکاوت، دین ودیانت میں ”حق گو“ سے بدرجہا بہتر و برتر ہوں ان کے تخیلات رد کر دیں، اور اگر ”حق گو“ اپنی باتوں کا کوئی ثبوت

رکھتے ہوں، تو میرے ان سوالات کا جواب جلد از جلد شائع کر دیں۔

قاہر سوالات

❶ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ قرآن کی آخری سورتوں کی ترتیب بشرطیکہ موجودہ ترتیب کو الٹ دیا جائے بالکل تاریخی ہے، کیا آپ کسی تاریخ ہی سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ قرآن کی سب سے آخری سورتیں سب سے پہلے نازل ہوئیں؟

❷ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ آنحضرت ﷺ غار حرا میں بے آب و دانہ مراقبہ کیا کرتے تھے۔

❸ تاریکی اور سناٹے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ پر خوف طاری ہونا اور اس کی وجہ سے "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَق" اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس" کے نازل ہونے کا ذکر قرآن میں کہیں ہے، یا کسی تاریخ میں یا محض آپ کا قیاس ہے؟

❹ آپ نے (صفحہ ۲۸) میں لکھا ہے کہ:

> "قرآن کو الٹ کر تیسواں پارہ پہلا پارہ کر دو ایسا کہ آخری سورہ شروع میں پڑھی جائے اور اس کے بعد اس کے ماقبل کی سورتیں، تو تم کو معلوم ہوگا کہ اٹھائیسویں پارے تک قرآن کی جو ترتیب کا تبان وحی نے لگائی ہے وہ بالکل تاریخی ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جو سورت نازل ہوئی ہے "قل اعوذ برب الناس" ہے، اس لئے کہ موجودہ ترتیب میں سب سے آخری سورہ وہی ہے لیکن (صفحہ ۵) کی عبارت جو اوپر نقل کی گئی ہے، اس میں آپ نے تصریح کی ہے کہ پہلے "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الفلق" نازل ہوئی پھر "قل اعوذ برب الناس" اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کو قرآن کریم سے کتنا تعلق ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ

قرآن پاک اٹھا کر کبھی دیکھتے بھی نہیں، اگر کسی بچے سے بھی پوچھ لیتے، تو وہ بھی آپ کو بتاتا کہ قرآن کریم کی سب سے آخری سورۃ "قل اعوذ برب الناس" ہے اگر آپ کہیں کہ میں جانتا ہوں کہ "قل اعوذ برب الناس" آخری سورہ ہے لیکن نزول میں وہ دوسرے نمبر میں ہے، لہٰذا عبارت (صفحہ ۵) بالکل صحیح ہے تو بتایئے کہ (صفحہ ۲۸) والی عبارت کی کیا تاویل ہے۔

۵ ان دونوں سورتوں کے نزول سے آنحضرت ﷺ کے قلب کا مطمئن ہونا "قُلْ هُوَ اللّٰه" کے نزول کے بعد قوم کو دعوت دینا، بوڑھے بدبخت چچا کا مذاق اڑانا، ابولہب کا عم رسول (ﷺ) ہونا، اور آپ کا دل گرفتہ ہو کر غار حرا کا دوبارہ رخ کرنا وغیرہ، قرآن کریم کی تفسیر بالرائے کے ساتھ آپ کو یہ اختیار بھی ملا ہے، کہ اپنی عقل و قیاس سے واقعات بھی گھڑ لیں؟

۶ کیا آپ کے قرآن میں "قل یا ایها الکافرون" سے پہلے "اذا جاء" کی سورہ ہے، اگر نہیں تو ترتیب الٹنے میں "قل یا ایها الکافرون" پہلے اور "اذا جاء" پیچھے کیسے ہو گئی۔ "حق گو" صاحب، اپنا کام کیجئے ان مباحث میں پڑ کر اپنی قرآن دانی کو کیوں رسوا کرتے ہیں۔

۷ سوال نمبر ۱، ۲، ۳ وغیرہ کا جواب یا تو قرآن سے دیجئے، یا کم از کم تاریخ سے لیکن تاریخ سے جواب دینے کی صورت میں یہ بتانا ہوگا کہ جب تاریخ و حدیث دونوں کا مدار روایت و نقل پر ہے، تو تاریخ معتبر اور حدیث نامعتبر کیوں ہو گئی، حالانکہ حدیث کی روایتی حیثیت تاریخ سے بہت زیادہ مستحکم اور ٹھوس ہے۔

تاریخی واقعات قیاس سے ثابت نہیں ہو سکتے

مجھے یہ حیرت ہے کہ "حق گو" صاحب باایں ہمہ ادعائے ہمہ دانی اب تک یہ نہیں جانتے کہ تاریخ قیاس کی دسترس سے باہر ہے، تاریخی واقعات یا کسی کے

حالات زندگی محض قیاس سے بیان نہیں کئے جاسکتے، بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے، کہ اس شخص کا زبانی یا تحریری بیان بلا واسطہ یا بواسطہ نقل در نقل پیش کیا جائے، جس نے ان واقعات و حالات کا مشاہدہ کیا ہو، اگر ایسا نہ ہو تو ہر شخص کو اختیار ہوگا، کہ وہ اپنے قیاس سے جس عہد کی چاہے، تاریخ مرتب کر لے، اور جس شخص کے حالات زندگی اپنے تخیل سے جس طرح چاہے لکھ دے۔

حدیث سحر پر ''حق گو'' کے اعتراضات

اتنی گزارش کے بعد سنئے ''حق گو'' صاحب آنحضرت ﷺ کے مسحور ہونے کے واقعہ کو ان وجوہ سے غلط قرار دیتے ہیں۔

❶ اگر یہ واقعہ صحیح ہو تو ان کفار کی تصدیق ہوتی ہے، جو آپ کو بطور اتہام کے ساحر و مسحور بتاتے تھے۔

❷ کیا سردار انبیاء کی یہی شان ہے، کہ آپ پر یہودی کا جادو چل جائے۔

❸ یہ واقعہ مدینہ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے زمانے کا بیان کرتی ہیں، تو کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے، کہ اس کا تعلق سب سے ابتدائی مکی سورتوں سے کیسے گھڑ لیا گیا۔

❹ اس واقعہ کی تردید و تکذیب قرآن شریف کی یہ آیتیں کر رہی ہیں۔

﴿قَالَ الکَافرون اِنْ تتبعُوْنَ الا رجُلاً مَسْحُورا وما انت بنعمة ربك بكاهِنٍ ولَاَ مَجنوُن، والنجْم اذ هَوى ما ضَلَّ صَاحِبكُم وَمَا غوى.﴾

جوابات

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی وجہ بھی صحیح اور واقعہ سحر کی تغلیط و تکذیب کے لئے کافی نہیں ہے، میں ''حق گو'' صاحب کی غلط فہمیوں کو ظاہر کرنے کے لئے ہر وجہ کا علیحدہ علیحدہ جواب لکھتا ہوں۔

حضور ﷺ کو مسحور کہنے سے کفار کا کیا مقصد تھا

پہلی وجہ یہ ہے کہ "حق گو" صاحب نے بالکل غور نہیں کیا کہ کفار کا اتہام کیا تھا، اگر وہ قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھے ہوتے، تو ان کو معلوم ہوتا، کہ مشرکین مکہ نے آنحضرت ﷺ کے دعویٰ نبوت کی تکذیب کے لئے مختلف راہیں اختیار کی تھیں، کوئی یہ کہتا تھا کہ محمد (ﷺ) کی عقل میں کچھ فتور نہیں ہے، انہوں نے جان بوجھ کر خدا پر افتراء کیا ہے، (معاذ اللہ) اور کوئی کہتا تھا کہ نہیں ان کی عقل میں فتور ہے، اور وہ (خاک بدہن دشمناں) دیوانہ ہو گئے ہیں، اور ان کا دعوت نبوت نتیجہ جنون ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿افتری علی اللہ کذبا ام بہ جنۃ﴾

ترجمہ: "یا انہوں نے جان بوجھ کر خدا پر افتراء کیا ہے، یا ان کو جنون ہے۔"

اور کوئی بدبخت بجائے مجنون کہنے کے آپ کو مسحور کہتا، لیکن منشاً اس کا وہی تھا، کہ آپ مجنون ہیں، کسی نے آپ کی عقل پر جادو کر دیا ہے، جس کی وجہ سے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا ہے، کفار مکہ کہنے کو یہ سب کچھ کہتے تھے، لیکن وہ خود بھی سمجھتے تھے، کہ آپ کا دامن ان تہمتوں سے بالکل پاک ہے، اور تاریخ شاہد ہے کہ ان میں کے بہت سے صاحبان عقل و دانش نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے، اور واقعات نے بھی ان کے اتہامات کی لغویت دنیا پر ظاہر کر دی ہے بہر حال کفار کے اتہام کا منشاء صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ آپ کے دماغ میں خلل اور عقل میں فتور ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ اتہام صرف کفار مکہ لگایا کرتے تھے، چنانچہ اس اتہام کا ذکر قرآن پاک کی صرف مکی سورتوں میں ہے، مدینہ میں جو آپ کے مخالفین تھے، ان میں سے کسی نے بھی یہ اتہام نہیں لگایا۔

سحر کا اثر حضور ﷺ کی عقل اور قوت ادارک ویقین پر قطعاً نہیں ہوا

اس تمہید کے بعد سنئے کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ پر جادو کئے جانے کا جو واقعہ مذکور ہے، وہ مدنی زندگی کا واقعہ ہے، اور مورخین نے تصریح کی ہے کہ یہ ۷ھ میں پیش آیا، دوسرے خود حدیث میں یہ تصریح موجود ہے کہ سحر کا صرف اتنا اثر آپ پر ہوا تھا کہ آپ کو خواہ مخواہ شبہہ پیدا ہو جاتا، کہ بی بی سے مقاربت کی ہے، حالانکہ آپ کو یقین ہوتا تھا کہ بی بی کے پاس گئے بھی نہیں ہیں، اور کھانا نہیں کھایا جاتا تھا، اور آنکھوں سے کچھ کم نظر آتا تھا، غرض یہ ہے کہ سحر کا اثر آپ کی عقل اور قوتِ ادراک ویقین پر بالکل نہیں ہوا تھا، پس ظاہر ہو گیا کہ کفار مکہ کے اتہام کی اس وقعہ سے قطعاً تائید نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس اتہام کا مقصود تو یہ تھا کہ (معاذ اللہ) آنحضرت ﷺ کا دماغ ماؤف اور عقل میں خلل ہے، اور حدیث میں جو واقعہ مذکور ہے، اس سے فتور عقل یا خلل دماغ نہیں ثابت ہوتا، بلکہ دوسرے عوارض جسمانی ثابت ہوتے ہیں، نیز کفار کی تائید اس واقعہ سے اس لئے بھی نہیں ہو سکتی، کہ کفار یہ اتہام مکہ میں لگایا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ آپ پر جادو کیا گیا ہے اور اس کی وجہ سے آپ کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا، اودعویٰ نبوت اسی خلل دماغ کا نتیجہ ہے، حالانکہ زمانہ قیام مکہ میں جس کی مدت تیرہ سال ہے، کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، پھر مدنی زندگی میں بھی پورے چھ سال تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی، پس اس واقعہ سے جو ۷ھ میں یعنی دعویٰ نبوت کے ۱۹ سال بعد ہوا، اس سے اتہام مذکور کی کیونکر تائید ہو سکتی ہے، کیا ''حق گو'' صاحب کو اتنی سمجھ بھی نہیں ہے کہ اتہام مذکور کی واقعیت اور کفار کی صداقت اس کے بغیر ممکن نہیں، کہ اتہام لگانے کے وقت آپ مسحور ہوتے، اور کفار کی تائید صرف ایسے واقعہ سے ہو سکتی ہے، جو اس وقت آپ کا مسحور ہونا ثابت

کرے، باقی وہ واقعہ جو دعویٰ نبوت کے ۱۹ سال بعد ہوتا ہے، اس سے کوئی تائید نہیں نکلتی، اور نہ وہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی نبوت سے انکار کرنے کے لئے حجت بن سکتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں کفار سے پوچھا جائے گا، کہ اگر تم دعویٰ نبوت کو سحر کا اثر کہتے ہو تو سحر تو ۱۹ سال کے بعد ہوا، لہٰذا بتاؤ کہ ۱۹ سال تک کس اثر کے ماتحت آپ دعوئے نبوت کرتے رہے اور تم ۱۹ سال تک آپ کو مسحور قرار دے کر کیوں جھوٹ بولتے رہے، کیا ''حق گو'' صاحب کفار کے وکیل بن کر اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں؟ اگر نہیں دے سکتے ہیں تو کیوں کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے کفار کی تائید ہوتی ہے۔

سحر کا اثر علاوہ سطحی ہونے کے عارضی تھا

حاصل کلام یہ کہ کفار جس وقت آپ کو سحر کے ساتھ متہم کرتے تھے، اس وقت بلکہ اس کے مدتوں بعد تک آپ مسحور نہیں ہوئے، اور جب آپ پر سحر کیا گیا، تو اس کا اثر آپ کی عقل وقوت ادراک ویقین پر مطلق کچھ نہ ہوا، حالانکہ کفار کے مسحور کہنے کا یہی مقصد تھا کہ (معاذ اللہ) آپ کا دماغ ماؤف تھا، پھر اس سحر کا اثر بھی آپ پر بنا برقول اصح صرف تین دن یا چار دن تھا، اس کے بعد بالکل زائل ہو گیا، لہٰذا اس سے کفار کی کچھ تائید نہیں ہوتی۔

واقعہ سحر حضور کے نبی ہونے کی روشن دلیل ہے

بلکہ ''حق گو'' صاحب کے علی الرغم یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کی ایک روشن دلیل ہے، غور کیجئے کہ مدینہ سے دو سو میل کے فاصلہ پر آپ پر سحر کیا جاتا ہے، اور جادوگر یہودی کی بہن کہتی ہے کہ اگر آپ نبی ہوں گے تو من جانب اللہ آپ کو اطلاع ہو جائے گی اور اپنے دعویٰ میں کاذب ہوں گے ان کو کچھ پتہ نہ چلے گا، تا آنکہ ان کی عقل جاتی رہے گی، حدیث میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بتا دیا جاتا ہے کہ کس نے جادو کیا، اور کہاں کیا اور اس کے دفعیہ

کی کیا صورت ہے، اور اس اطلاع کے ذریعہ ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ آپ سچے ہیں۔

ساحر کی ناکامی ونامرادی

دوسری وجہ تکذیب واقعہ کی پہلے سے بھی عجیب ہے، یہود کا جادو چلا کہاں؟ اس نے چاہا تھا، کہ آپ کی عقل جاتی رہے، لیکن اس کی ہوس پوری نہ ہوئی، اور نبی ﷺ کی عقل پر کچھ اثر نہ ہوا، اور جو اثر ہوا، وہ فقط جسمانی عوارض کی شکل میں ہوا، اور انبیاء جسمانی عوارض وامراض سے منزہ نہیں ہیں، دیکھئے خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقولہ قرآن میں نقل فرمایا ہے "انی سقیم" (میں بیمار ہوں) اور فرمایا "واذکر عبدنا ایوب اذ نادی ربہ انی مسنی الشیطان بنصب وعذاب" (یعنی یاد کیجئے ہمارے بندے ایوب کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھ کو شیطان نے بیماری کی تکلیف اور عذاب پہنچایا)۔

انبیاء عوارض جسمانی سے مبرا نہیں ہوتے

معلوم ہوا کہ انبیاء بیماریوں سے مبرا نہیں ہوتے، اگر کہئے کہ انبیاء طبعی طور پر بیمار ہو سکتے ہیں، لیکن کفار ومخالفین دین کے ہاتھ سے ان کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا، تو یہ بھی غلط ہے، قرآن نے متعدد مقامات میں یہودیوں کی نسبت فرمایا ہے "یقتلون النبیین بغیر حق" یعنی یہودیوں نے بہتیرے نبیوں کو ناحق قتل کر دیا، اور تاریخوں سے ثابت ہے، کہ خود آنحضرت ﷺ نے کفار کے ہاتھوں سے بڑی بڑی اذیتیں اٹھائیں، سر مبارک زخمی ہوا، دندان مبارک شہید ہوا، اور ڈھیلوں اور پتھروں سے جسم شریف لہولہان ہو گیا، پس جب یہ عوارض انبیاء علیہم السلام کے جسم پر کفار ومخالفین کے ہاتھوں سے طاری ہو سکتے ہیں تو یہودیوں کے سحر سے جو عوارض طاری ہوئے، وہ کیوں ناممکن معلوم ہوتے ہیں، وہ بھی تو امراض واسقام وعوارض جسمانی ہی ہیں، ہاں انبیاء کرام علیہم السلام اس بات سے بے شک معصوم ومنزہ ہیں کہ کوئی مخالف ان کے

عقائد میں تبدیلی پیدا کر دے، یا ان سے خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرا دے، یا کسی نوع سے ان کو بہکا دے، یہ سب باتیں قطعاً ناممکن ہیں، اور اس معنی کے لحاظ سے کسی یہودی نصرانی، مجوسی یا مشرک کا جادو سیّد الانبیاء ﷺ بلکہ کسی نبی پر نہیں چل سکتا۔

"حق گو" کا جہل

اور تیسری وجہ اور بھی عجیب ہے "حق گو" صاحب محض اپنے تخیل سے معوذتین کو سب سے پہلی مکی سورتیں قرار دے کر پوچھنے لگے، کہ "سحر کا واقعہ تو مدینہ کا ہے پھر اس کا تعلق ان سورتوں سے کیسے گھڑ لیا گیا۔" اے جناب! معوذتین کو مکی سورتیں کہتا کون ہے، یہ سورتیں تو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں، واقعہ سحر کے علاوہ اور احادیث سے بھی انکا مدنی ہونا ثابت ہے، اور اس کے علاوہ دنیا میں جتنے قرآن ہیں، چاہے وہ جس فرقہ اسلامی کے لکھوائے اور چھپوائے ہوئے ہوں سب میں ان دونوں کو مدنی ہی لکھا ہے لہٰذا آپ سے یہ سوال ہے کہ آپ ان کو مکی کس دلیل کی بنا پر کہتے ہیں، آپ کے تخیل و توہم و قیاس و رائے کے سوائے کوئی دلیل ہو تو پیش کیجئے، اس لئے کہ کسی سورۃ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی ایک تاریخی واقعہ اور ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر کی ایک بات ہے، اس میں قیاس کو دخل نہیں ہو سکتا، لہٰذا کسی ایسے شخص کا بیان پیش کیجئے جس نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا ہو، یا جو اس وقت موجود رہا ہو، ہم ایسے ہی مستند تاریخی بیان کی بنا پر اس کے قائل ہیں کہ یہ سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں، ثبوت کے لئے حضرت عقبہ بن عامر ؓ صحابی رسول ﷺ کا بیان ترمذی (صفحہ ۴۱۲)، مسلم (جلد ۱ صفحہ ۲۷۲) میں دیکھئے۔

سورۂ فلق اور واقعۂ سحر

نیز آپ کا خیال ہے کہ جب غار حرا میں تنہائی اور سناٹے کی وجہ سے آپ پر

خوف طاری ہوا تو یہ سورتیں نازل ہوئیں، لہٰذا بتائیے کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ حضور ﷺ پر خوف طاری ہوا، یہ کس تاریخ میں مذکور ہے، اور اس کے ساتھ یہ بھی بتائیے کہ سورہ فلق میں یہ جو مذکور ہے ہے کہ ”وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ“ (یعنی میں پناہ مانگتا ہوں گرہوں میں پھونکنے والی عورتوں کے شر سے) اس کا کیا مطلب ہے، اور اس کو حرا میں خوفزدہ اور متوحش ہونے کے (فرضی) واقعہ سے کیا تعلق ہے، اور کیا گرہوں میں پھونکنا سحر و جادو کا کنایہ نہیں ہے، اور کیا اس سے مفہوم نہیں ہوتا، کہ نبی پر بھی سحر کا اثر بصورت عوارض جسمانی ہوسکتا ہے، اس لئے کہ اگر اثر ہونا محال ہوتا، تو اس سے پناہ مانگنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

”حق گو“ کی قرآن مجید سے بے تعلقی

بہرحال سورہ فلق خود دلیل ہے، کہ اس سورۃ کا تعلق واقعہ سحر سے ہے، چوتھی وجہ تکذیب واقعہ کی پہلی تمام وجہوں سے بہت زیادہ عجیب اور قرآن کریم سے آپ کی بے تعلقی کی بین دلیل ہے، آپ کی پیش کردہ تین آیات میں سے کسی میں بھی یہ مذکور نہیں ہے، کہ انبیاء پر سحر کا اثر بصورت عوارض جسمانی محال ہے، لہٰذا میں نہیں سمجھ سکتا، کہ ان آیات سے واقعہ سحر کی کس طرح تکذیب ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلی آیت میں یہ دیکھ کر کہ مخالفین نے آنحضرت ﷺ پر مسحور ہونے کی تہمت لگائی ہے، پس اگر واقعۂ سحر صحیح ہو، تو اس سے مخالفین رسول اللہ ﷺ کے اتہام کی تائید ہوگی، یہ لکھ مارا لیکن میں مخالفین کے مسحور کہنے کا مقصد اور اس اتہام کی تاریخ ذکر کر کے ثابت کر چکا ہوں کہ واقعۂ سحر سے ان کے اتہام کی کسی طرح تائید نہیں ہوتی، رہی دوسری اور تیسری آیت تو ان میں آنحضرت ﷺ سے جنون اور گمراہی کی نفی کی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ جنون کا تعلق عقل و دماغ سے اور گمراہی کا تعلق اعتقاد و علم سے ہے، اور میں ثابت کر چکا ہوں کہ سحر کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی عقل

شریف و دماغ عالی میں نہ کوئی فتور پیدا ہوا، اور نہ آپ کے اعتقادات وعلوم پر اس کا کوئی اثر پڑا تھا، لہٰذا ان آیات کے خلاف کوئی بات واقعۂ سحر میں نہیں ہے، پس ان آیات کو واقعۂ سحر کی تکذیب کے لئے پیش کرنا آپ ہی کہئے کہ حماقت ہے یا نہیں۔

''حق گو'' کا جدید قرآن

اس کے بعد میں ''حق گو'' صاحب سے پوچھوں گا کہ ''وَقَالَ الکٰفرون ان تتبعون الّا رجلاً مسحورًا'' کس پارے کی آیت ہے، ہم نے قرآن کریم کے جتنے نسخے دیکھے ہیں، ان میں ''وَقَالَ الظٰلمُون'' ہے افسوس ہے کہ آپ کو اتنا بھی تعلق قرآن سے نہیں ہے، کہ اس کو صحیح لکھ یا پڑھ سکیں۔

''حق گو'' صاحب نے چوتھا عنوان یہ رکھا ہے۔

شیطان آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے دل ومنہ میں جگہ پاتا ہے (نعوذ باللہ)

اور اس عنوان کے ماتحت لکھا ہے ''الم نشرح لك صدرك'' کی تفسیر میں شق صدر کی روایت حدیث پڑھو اور ''تلك الغرانیق العلی'' کی تفسیر جس کی تصدیق علمائے مستند کر رہے ہیں، پھر بہ طور طنز کے یہ بھی لکھا ہے۔

> ''مگر راوی نے ''ربِّ اشرح لی صدری'' کی دعائے موسیٰ میں حضرت موسیٰ کے شق صدر کی روایت بیان نہ کی۔''

''حق گو'' صاحب کا مطلب یہ ہے کہ شق صدر کی بعض روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ فرشتہ نے آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا قلب مبارک چاک کر کے اس میں سے خون کی ایک پھٹکی نکالی، اور کہا ''یہ شیطان کا حصہ تھا'' لیکن اس روایت کی بنا پر مذکورہ بالا عنوان قائم کر کے حدیث سے بدظن کرنا ''حق گو'' صاحب کی کج فہمی یا ابلہ فریبی ہے،

اس لئے کہ صحیح مسلم کی جس روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں اس میں صراحۃً یہ بھی مذکور ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے، جب آنحضرت ﷺ بالکل کمسن اور بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے، یعنی قبل از نبوت بلکہ قبل از بلوغ کا واقعہ ہے۔[1]

پس بچپن کے واقعہ کو نبوت کے بعد کا واقعہ ظاہر کرنا کتنی بڑی بددیانتی ہے، پھر یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت میں خیر وشر نیکی و بدی اور تقویٰ و فجور کا مادہ ودیعت رکھا ہے، ارشاد ہے ”وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا“ اور فرمایا ”وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ“ اور چونکہ انبیاء بھی انسان ہی ہوتے ہیں، لہٰذا اصل فطرت انسانی کے تقاضا سے ان میں بھی ابتدائے عمر میں سب قوتیں موجود ہوتی ہیں، جو دوسرے انسانوں میں ہوتی ہیں، مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام گمراہوں کو راہ پر لگانے، اور بدکاروں کو نیکوکار بنانے اور دلوں کی گندگیوں کو دور کرنے کے لئے مبعوث ہوتے ہیں، اس لئے بعثت بلکہ بلوغ سے پہلے ہی ان کے قلوب سے مادۂ فجور نکال کر پھینک دیا جاتا ہے، اور برائی کی طرف جو قوت مائل کرنے والی ہے، اس کو بالکل نیست ونابود کردیا جاتا ہے۔

معجزۂ شق صدر

شق صدر والی روایت میں یہی بیان ہے کہ وہ مادہ جس کا خاصہ بدی کی جانب مائل کرنا ہے، اور جس کی وجہ سے شیطان کی مرضی کے موافق کام صادر ہوتے ہیں، اس مادہ کو آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک سے نکال کر پھینک دیا گیا، اور نبوت بلکہ بلوغ سے بہت پہلے بچپن ہی میں قلب شریف کو شیطانی تصرفات اور شیطانی وساوس وخطرات سے مامون ومصؤن کردیا گیا اور اصل فطرت انسانی کے لحاظ سے بدی کی طرف جو میلان ممکن تھا، اس کے دھبے دھوکر قلب مبارک کو صاف ستھرا اور آئینہ کی طرح روشن وشفاف بنا دیا گیا، یہ حدیث شق صدر کا روشن مفہوم ہے، جس سے

---

[1] مسلم: ۱/۱۹۲، شریح شفا: ۲/۲۰۲

صاف ظاہر ہے کہ حدیث آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک کو شیطانی تصرفات سے بالکلیہ صاف و پاک ثابت کرنا چاہتی ہے، مگر ’’حق گو‘‘ کو حدیث کی دشمنی میں اس کا الٹا اثر نظر آتا ہے سچ ہے۔

ع گل است سعدی و در چشم دشمنان خار است

’’رب اشرح لی صدری‘‘ کی تفسیر میں راویوں کا موسیٰ علیہ السلام کے شق صدر کا ذکر نہ کرنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ شق صدر آنحضرت ﷺ کی روایت جعلی نہیں ہے، اس لئے کہ اگر جعلی ہوتی تو جہاں جہاں شرح صدر کا لفظ ہوتا، وہاں ایک ایک روایت بنا لی جاتی، مگر چونکہ ایسا نہیں ہے بلکہ راوی واقعات کا پابند ہے، اس لئے آنحضرت ﷺ کے شق صدر کا ذکر کرتا ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شق صدر کا ذکر نہیں کرتا کہ واقعہ یوں نہیں ہے۔

تلک الغرانیق العلی پر بحث

حدیث شق صدر کے بعد ’’تلك الغرايق العلى‘‘ والی جس روایت کی طرف ’’حق گو‘‘ نے اشارہ کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک بار سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی جب ’’منوٰة الثالثة الاخرى‘‘ پر پہنچے تو کسی شیطان نے یہ کلمات شرارت سے بک دیئے ’’تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى‘‘ اس روایت کو غور سے پڑھئے، اور بتایئے کہ ان کو ’’حق گو‘‘ صاحب کے مدعا سے کیا تعلق ہے، اس میں یہ کہاں مذکور ہے کہ شیطان نے آنحضرت ﷺ کے دہن مبارک میں یہ کلمات ڈالے تھے پھر اس روایت کا حوالہ دیکر مذکورۂ بالا عنوان قائم کرنا صریح فریب کاری ہے یا نہیں، تلاوت قرآن کے وقت کفار و مشرکین کی اس قسم کی شرارتوں کا ذکر تو خود قرآن کریم میں موجود ہے ’’وَقَال الذين كفرُوا لا تسمعوا لهٰذا القرآن وَالغوا فيه لعلكم تغلبُون.‘‘ یعنی کافروں نے کہا

کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس کی تلاوت کے وقت گڑبڑ مچاؤ، شور وغوغا کرو، شاید تم غالب آجاؤ، اسی مضمون کا ذکر اوپر والی حدیث میں بھی ہے۔

اس کے بعد سنئے کہ جن علماء نے اس روایت کی تصدیق کی ہے، وہ صرف اتنے مضمون کی تصدیق کرتے ہیں،[1] باقی یہ مضمون کہ شیطان نے یہ کلمات آنحضرت ﷺ کی زبان پر سہواً یا نیند کی حالت میں جاری کرادیئے تو اس کا علماء نے سخت انکار کیا ہے، اور بڑے شد ومد سے اس کی تغلیط وتکذیب کی ہے۔[2] مولوی شبلی صاحب نعمانی نے سیرۃ النبی جلد اول میں اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا ماحصل وہی ہے، جو اوپر مذکور ہوا ’حق گو‘ صاحب نے اپنے ناظرین کو سیرۃ النبی کا یہ مقام دیکھنے کا مشورہ دیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بحث کو اس میں پڑھ چکے ہیں لیکن تعجب ہے کہ اس کے بعد ان کو سطور بالا لکھنے کی کیونکر جرأت ہوئی۔

”حق گو“ صاحب نے پانچواں عنوان یوں ذکر کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ مکر وخدع سے اپنے دشمنوں کو قتل کرادیتے تھے

اور اس سرخی کے نیچے کعب ابن الاشرف یہودی کے قتل کا واقعہ نقل کرکے لکھا ہے:

> ”میرے نزدیک آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک پر راوی نے ایک بدترین اتہام لگایا ہے، یقیناً نہ آپ اس قتل کے محرک تھے، نہ آپ کو اس کا علم تھا، کعب کو اس کے کسی عرب دشمن نے اپنے ذاتی عناد کی وجہ سے یا اس کی بعض بدکرداریوں کی پاداش میں قتل کردیا ہوگا، اور چونکہ وہ

---

[1] فتح الباری: ۳۰۷/۸، شرح شفا: ۳۳۵/۲

[2] فتح: ۳۰۷/۸، شرح شفا: ۳۳۵/۲، ناسخ و منسوخ ص ۱۹۰، ۱۹۱ وغیرہ

آنحضرت ﷺ کی نسبت فتنہ انگیزی کر رہا تھا، اس لئے دشمنانِ دین نے قتل کی تہمت آپ کے سر لگا دی۔"

"حق گو" صاحب اگر اپنے اس بیان پر کوئی کمزور سے کمزور تاریخی شہادت بھی پیش کر دیتے تو ہم کو ان سے کوئی وجہ اختلاف نہ تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، بے دلیل اور بے ثبوت، پھر ہم کو حیرت ہے کہ جب وہ کعب کو بدکردار تسلیم کرتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ فتنہ انگیز بھی تھا، تو ایسے بدکرداروں اور فتنہ انگیزوں کے قتل سے آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک پر کون سا اعتراض پڑ سکتا ہے، کیا مہذب سے مہذب حکومتیں فتنہ انگیزوں کے ساتھ یہی برتاؤ نہیں کیا کرتیں؟ کیا قرآن میں "الفتنة اَشَدُّ مِنَ الْقَتلِ" یعنی فتنہ انگیزی کو قتل سے زیادہ سخت اور برا نہیں فرمایا ہے، کیا قرآن میں فتنہ پردازوں کی نسبت یہ حکم نہیں ہے، "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنة" یعنی ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، کیا کعب وہی شخص نہیں ہے جس کی بابت مورخین یک زبان ہو کر بیان کرتے ہیں کہ وہ بدر کے مشرکین مقتولین کے نہایت پر درد مرثیے لکھ کر مکہ لے گیا، اور مشرکین مکہ کو انتقام لینے کے لئے برانگیختہ کیا[1] اور حرم کا پردہ پکڑوا کر اس کے لئے معاہدہ کرایا[2] قصیدوں میں آنحضرت ﷺ کی خوب توہین کی[3] مسلمان شریف خاتونوں کا نام لے کر اظہار تعشق کیا اور ان کی بے حرمتی کی[4] آنحضرت ﷺ کو خفیہ قتل کرا دینے کی سازش کی[5] اور کفار قریش وغیرہ کو آنحضرت ﷺ کے قتل کے لئے ابھارا[6] اور آنحضرت ﷺ کی دعوت کر کے کچھ لوگوں کو متعین کر دیا، کہ جب آپ تشریف لائیں، تو دھوکے سے آپ کو ہلاک کر دیں[7] اور کیا کعب اس قوم کا رئیس و سردار نہیں

---

[1] سیرۃ ابن ھشام ج۲
[2] فتح الباری: ص ۲۳۷، خمیس: ص ۵۱۷
[3] ابوداؤد، ترمذی، فتح: ص ۲۳۶
[4] فتح الباری: ص ۲۳۶
[5] تاریخ یعقوبی: ص ۱۲
[6] ابن سعد ابوداؤد: ۲۱/۲
[7] فتح: ص ۲۳۷

ہے جس نے خود انصار کے دو قبیلوں اوس وخزرج کو لڑا کر اہل اسلام کی بربادی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہا تھا۔[1] پھر اگر ایسے ننگ انسانیت وجود سے زمین پاک کر دی گئی، تو اس میں کیا قباحت ہے، کعب صرف آنحضرت ﷺ ہی کا دشمن نہیں تھا، بلکہ تمام انصار اور کفار قریش کا بھی دشمن تھا، اس نے اپنے خبث بطن سے سب کو عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا پس اس کو زندہ رہنے دینا ہی بڑا ظلم تھا، نہ کہ اس کا قتل کر دینا۔

اس روایت پر ”حق گو“ صاحب کی جرح اور اس کا جواب

اس کے بعد ”حق گو“ صاحب اس واقعہ کی روایت پر جرح کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

> ”اوّل سوال تو یہ ہے کہ محمد بن مسلمہ (قاتل کعب مذکور) کون شخص تھے اگر صحابی تھے اور یقیناً جیسا کہ روایت سے ظاہر ہے کہ صحابی تھے تو خود ان کی روایت ہم تک براہ راست بغیر ایک دوسرے صحابی کی سند کے کیوں نہیں پہنچی، کیوں حضرت جابر کو بیچ میں ڈالا گیا۔“

سبحان اللہ کیا جرح ہے، اولاً تو ہم ”حق گو“ صاحب کو بتانا چاہتے ہیں، کہ یہ محمد بن مسلمہ کی روایت نہیں ہے، بلکہ ان کا ایک فعل اور ایک واقعہ ہے، جس کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے، اور اس واقعہ کے وقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ خود موجود تھے، بہتر ہوگا کہ آپ صحیحین پر ایک نگاہ پھر ڈال لیجئے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ محمد بن مسلمہ کا بیان نہیں نقل کر رہے ہیں، دوسرے اگر بالفرض حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہی نقل کیا ہوتا، تو اس میں کیا قباحت تھی، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سن میں محمد بن مسلمہ سے بہت چھوٹے تھے، اور کمسن صحابہ رضی اللہ عنہم بڑی عمر والے صحابہ رضی اللہ عنہم سے برابر روایت کرتے ہیں، اور صحابہ پر کیا موقوف ہے، آج بھی ایک مشہور

---

[1] اصابہ: ۸۸/۱

استاذ کے قدیم و معمر شاگردوں سے اس کے نوجوان اور کمسن شاگردوں کے پڑھنے کی صدہا نظیریں موجود ہیں، پس اسی طرح حضرت جابر ؓ باجود شاگرد رسول ﷺ ہونے کے محمد بن مسلمہ ؓ کے شاگرد بھی ہو سکتے ہیں، اور چونکہ محمد بن مسلمہ ؓ حضرت جابر ؓ سے ۳۵ سال پہلے فوت ہوئے، اس لئے عمرو بن دینار ان سے براہ راست اس کو نہ سن سکے، بلکہ حضرت جابر ؓ سے اس کی روایت کی، محمد بن مسلمہ کی وفات ۴۳ھ اور حضرت جابر ؓ کی وفات ۷۸ھ میں ہوئی۔[1] پس ”حق گو“ صاحب کا محمد بن مسلمہ ؓ کے حضرت جابر ؓ سے پہلے وفات پانے کا انکار کرنا جہالت اور بے خبری ہے، اور اگر ”حق گو“ صاحب کا یہ خیال ہے کہ اس واقعہ کو حضرت جابر ؓ نے کیوں بیان کیا، محمد بن مسلمہ کو بیان کرنا چاہئے تو میں ان سے پوچھوں گا کہ یہ کہاں کا اصول ہے، کہ جو واقعہ جس شخص سے تعلق رکھتا ہو اس کو وہی شخص بیان کرے تو قبول کیا جائے گا، ورنہ نہیں، اگر ”حق گو“ صاحب کا یہی اصول ہے تو پھر ان کے نزدیک سارا ذخیرہ تاریخ نامعتبر اور بے کار ہوگا، اس لئے کہ عموماً تاریخوں میں جن اقوام و اشخاص کے حالات لکھے گئے ہیں وہ خود ان کے بیان کئے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ دوسرے دیکھنے والوں کے بیانات ہیں، بہر حال یہ نہایت لغو جرح ہے، جس سے روایت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، خصوصاً جب کہ یہ واقعہ دوسرے طریق سے بھی ثابت ہے، چنانچہ حاکم نے مستدرک میں اس کو محمد بن ابی عبس ؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے، حضرت ابو عبس بھی مذکور کے قتل میں شریک تھے، یہ محمد بن ابی عبس انہی کے لڑکے ہیں، اور ابوداؤد و ترمذی نے عبداللہ بن مالک کی روایت سے بھی ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ اور طریقوں سے بھی یہ واقعہ مروی ہے۔

”حق گو“ صاحب کی دوسری جرح

اس کے بعد ”حق گو“ صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] زرقانی: ۲/۸، تذکرۃ الحفاظ

> ”دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد بن مسلمہ پیدائشی مسلمان تھے، یا خود ایمان لائے تھے، بہر صورت ان کا آنحضرت کا ہمنام ہونا عجب معنی رکھتا ہے، کیوں کہ عرب میں آنحضرت ﷺ سے پہلے محمد کسی کا نام نہیں رکھا گیا، اور عرصہ تک آنحضرت کے اسم مبارک پر لوگ فرط ادب سے نام رکھنا جائز نہ رکھتے تھے۔“

جواب: ”حق گو“ صاحب کی قلت معلومات کا یہ حال ہے کہ وہ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا کچھ حال نہیں جانتے، پہلے سوال میں بھی انہوں نے اس سے بے علمی کا اظہار کیا ہے، اور اس سوال میں بھی، حالانکہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بہت مشہور صحابی ہیں، اور وہ آنحضرت ﷺ کے قدوم مدینہ سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایمان لا چکے تھے،[1] بعثت سے ۲۲ سال پہلے پیدا ہوئے، اور ۴۳ھ میں وفات پائی۔[2]

بے علمی کا دوسرا مظاہرہ

ان کا یہ لکھنا ہے کہ:

> ”عرب میں آنحضرت ﷺ سے پہلے کسی کا نام محمد نہیں رکھا گیا۔“

حالانکہ آنحضرت ﷺ کی ولادت شریفہ سے کچھ پہلے بیس آدمیوں کا محمد نام رکھا گیا، اور ولادت کے بعد بھی یہ نام رکھا گیا، جن میں ایک محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔[3] ہاں یہ صحیح ہے کہ ابتدائے آفرینش عالم سے لے کر ولادت شریفہ سے کچھ پہلے تک کسی کا یہ نام نہیں رکھا گیا لیکن جب عرب میں خبر مشہور ہوئی کہ نبی آخر الزماں کا زمانہ اب قریب ہے، اور ان کا نام محمد (ﷺ) ہوگا، تو بہت سے لوگوں نے اس توقع میں کہ شاید یہ دولت ہمارے ہی حصہ میں آئے اپنے لڑکوں کو اس نام سے موسوم

---

[1] مستدرك حاكم: ص ٤

[2] زرقانی: ٨/٢

[3] فتح الباری: ٣٥٨/٦

کیا۔[1]

''حق گو'' صاحب کا یہ کہنا کہ۔

''عرصہ تک فرط ادب سے یہ نام نہیں رکھا جاتا تھا۔''

بالکل صحیح ہے مگر یہ آپ کے مبعوث ہونے کے بعد کا واقعہ ہے، اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا یہ نام بعثت سے پہلے رکھا گیا ہے، باقی اس کے ثبوت ہونے میں صحیح مسلم کی جو حدیث انہوں نے نقل کی ہے، وہ ان کے مدعا کے خلاف ہے، اس لئے کہ اس میں آنحضرت ﷺ نے صراحۃً اجازت دی ہے کہ میرا نام رکھو مگر میری کنیت نہ رکھو۔

''حق گو'' صاحب کی تاریخ دانی

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب لکھتے ہیں:

> ''کعب کا واقعہ قتل بدر کے بعد پیش آیا یا بقول شبلی ۳ھ شوال میں کعب بنی نضیر کا سردار تھا بنی نضیر سے آپ کی اس وقت کوئی مخالفت نہ تھی، نضیر کی عہد شکنی کا واقعہ جنگ احد کے بعد کا ہے، جب کہ بنی نضیر نے دو مسلمانوں کو دھوکے سے قتل کر دیا تھا، اور جب آنحضرت ﷺ ان کے پاس خون بہا لینے کے لئے گئے، تو انہوں نے آپ کے قتل کی سازش کی، اس کے بعد وہ لوگ جلاوطن کر دیئے گئے، اگر کعب کا واقعہ بدر کے بعد کا ہے، تو بنی نضیر نے فوراً عہد شکنی کیوں نہیں کر لی۔''

مجھے حیرت ہے کہ جس شخص کے معلومات کا یہ حال ہو وہ کسی علمی مسئلہ پر قلم اٹھانے کی کس طرح جرأت کرتا ہے، شبلی نے کہیں یہ نہیں لکھا ہے، کہ کعب شوال ۳ھ میں قتل ہوا بلکہ انہوں نے ربیع الاول ۳ھ لکھا ہے، کعب بنی نضیر کا سردار کیا

---

[1] فتح الباری: ٦/٣٥٨

معنی وہ اس قبیلہ ہی سے نہ تھا، یہ بھی غلط ہے کہ بنی نضیر سے آپ کی اس وقت کوئی مخالفت نہ تھی، اس لئے کہ ابوداؤ (جلد۲ صفحہ۱۲۲) زرقانی (جلد۲ صفحہ۸۱) اور فتح الباری (جلد۷ صفحہ۲۳۲) میں بسند صحیح مذکور ہے کہ قریش نے بدر کے بعد بنی نضیر کو آنحضرت ﷺ کی مخالفت پر ابھارا، اور بنونضیر نے بدعہدی اور پیمان شکنی کا عزم مصمم کر کے آنحضرت ﷺ کے پاس ایک پیام بھی بھیجا، جس کا منشا دھوکے سے آپ کو قتل کر دینا تھا، اس سازش کا ذکر سیرۃ النبی (جلد۱ صفحہ۳۷۲) میں بھی ہے، یہ تین باتیں میں نے نمونہ کے طور پر لکھ دی ہیں، ورنہ ''حق گو'' صاحب نے انہی چند سطروں میں اور غلط بیانیاں بھی کی ہیں۔

کعب بن الاشرف کے قتل کا سبب

اس کے بعد میں ''حق گو'' صاحب کو بتانا چاہتا ہوں کہ کعب کے قتل کا واقعہ بنی نضیر کی دشمنی وعداوت کی بنا پر پیش نہیں آیا تھا، بلکہ خود اس کی ذاتی فتنہ پردازیاں اور بدمعاشیاں اس کا سبب تھیں، جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، اور خود آپ کو بھی اس کے ناپاک، فتنہ پرداز اور فتنہ انگیز ہونے کا اقرار ہے، پس گردن زدنی ہونے کے اتنے اسباب کو ناکافی سمجھ کر بنونضیر کی مخالفت کا تلاش کرنا اور اس کے نہ ملنے پر اس واقعہ کا انکار کر دینا کیا سراسر حماقت نہیں ہے؟

پھر ''حق گو'' صاحب نے اتنا بھی نہ سمجھا کہ اگر کعب کے قتل کا سبب یہ ہوتا کہ وہ بنونضیر سے تھا، اور بنونضیر نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت کی ہے، تو اس صورت میں حی بن اخطب، کنانہ اور سلام رؤسائے نضیر قتل کرائے جاتے، نہ کہ کعب، جو کہ نضیری نہ تھا، بلکہ عربی النسل طائی تھا۔

بنونضیر کی جلاوطنی کس سنہ میں ہوئی

اس کے بعد میں ''حق گو'' صاحب کو یہ بھی بتا دوں کہ بنونضیر کی عہد شکنی اور

جلاوطنی کا زمانہ اگرچہ بعض لوگوں نے جنگ احد کے بعد بتایا ہے لیکن قوی اور زیادہ مستحکم قول یہ ہے کہ ان کی جلاوطنی کا قصہ غزوۂ بدر کے چھ مہینے بعد پیش آیا، زرقانی نے شرح مواہب (جلد۲ صفحہ ۸۰) میں اسی کو قوی ثابت کیا ہے، اور حاکم کی مستدرک میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس کی تصریح ہے، اور بخاری میں بروایت زہری اسی کو پہلے ذکر کیا ہے، اور ابوداؤد والی روایت مذکورۂ بالا سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، اور ابن مردویہ وعبد بن حمید کی ایک روایت صحیحہ بھی اس کی مؤید ہے خلاصۂ کلام یہ کہ اولاً تو راجح اور قوی قول کی بنا پر بنونضیر کی جلاوطنی وعہد شکنی کا واقعہ غزوہ بدر کے چھ ماہ بعد پیش آیا، اور اگر غزوۂ احد کے بعد بھی پیش آیا ہو تو اس سے کعب کا واقعہ قتل کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لئے کہ اس کے قتل کا سبب بنو نضیر کی پیمان شکنی نہ تھی، ''حق گو'' صاحب نے اس کے علاوہ اور بھی کئی تاریخی غلطیاں کی ہیں جن سے ہم بخوف طوالت اغماض کرتے ہیں۔

خلفائے بنوامیہ وبنی عباس پر تبرابازی

اس کے بعد فرماتے ہیں:

> ''میرے نزدیک یہ اتہام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر محض اس لئے لگایا گیا ہے کہ خلفائے بنی امیہ و بنی عباس بلکہ ان کے بعد رؤساء والیانِ ملک کو اپنے اپنے مخالف کو دھوکے سے قتل کرا دینے کے لئے سنت رسول کی ایک سند ہاتھ آجائے۔''

ہم کو ''حق گو'' صاحب کی اس بدحواسی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کبھی تو وہ یہ لکھتے ہیں کہ حدیث کی اشاعت عباسیوں کی خلافت میں ہوئی (دیکھو صفحہ ۴) اور یہاں یہ ظاہر کیا کہ خلفائے بنی امیہ ہی کے زمانہ میں حدیث شائع ہو چکی تھی، اور اس کے ساتھ ہم کو ان کی مسلم دشمنی وقوم کشی اور مغرب زدگی و یورپ پرستی پر بھی بے حد

حیرت ہے نہیں معلوم ’’حق گو‘‘ صاحب کس قسم کے مسلمان ہیں کہ خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کو بلا استثناء نفس پرور خواہش پرست اور خونخوار و دغاباز قرار دیتے ہوئے ان کو شرم نہیں آتی، نہ علمائے محدثین کو ’’نفس پروروں‘‘ اور ’’خونخواروں‘‘ کا معین و مدد گار کہتے ہوئے ذرا حیادامنگیر ہوتی ’’حق گو‘‘ صاحب نے اس حدیث کے وضع کی ایک علت پیدا تو کی لیکن میرا دعویٰ ہے کہ وہ اور ان کے اعوان و انصار کسی خلیفہ یا والی ملک کا کوئی ایسا واقعہ نہیں دکھا سکتے کہ اس نے کسی دشمن کو دھوکے سے قتل کرا کے اس حدیث سے حجت پکڑی ہو۔

اس کے بعد ’’حق گو‘‘ صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اگر ان کے خیال میں اس حدیث کے وضع کرنے سے یہ مقصود تھا، تو ذیل کی حدیثیں کیوں ’’وضع‘‘ کی گئیں۔

① جو شخص کسی معاہد کو بے وجہ قتل کر دے، تو اس پر جنت حرام ہے، اس کو جنت کی ہوا بھی نہ لگے گی۔[1]

② ہر عہد شکن کے لئے قیامت میں اس کی بدعہدی کا ایک جھنڈا گاڑا جائے گا جس سے اس کی پیمان شکنی کو رسوا کیا جائے گا۔[2]

③ فتح مکہ کے دن ابوسفیان اور ان کی بی بی ہندہ کو جس نے عم رسول حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبایا تھا، معافی دینا، اور نیز یہ اعلان کر دینا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اس کے لئے بھی امن کی ذمہ داری ہے۔[3]

اس قسم کی صدہا احادیث اور واقعات جو کتب احادیث میں مذکور ہیں، آخر وہ کس لئے وضع کئے گئے، ’’حق گو‘‘ صاحب ہوش کی بات کیجئے، عقل سے اتنی بیگانگی اچھی نہیں۔

’’حق گو‘‘ صاحب نے چھٹا عنوان یوں قائم کیا ہے۔

---

[1] بخاری، ابوداؤد، نسائی [2] بخاری وغیرہ [3] فتح الباری: ج۸

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عکل وعرینہ کی قوم سے نہایت عذاب اور بے دردی سے انتقام لینا

اوائل صدی کے مسلمانوں پر حملہ

اس عنوان کے ماتحت اپنی مسلم دشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمان قوم اور وہ بھی اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں کی شان میں یوں قصیدہ خوانی کی ہے:

> ''اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں میں بکثرت جنگ وفتوحات و خونریزی سے یہ ذہنیت پیدا ہوگئی تھی، کہ کسی شخص کے شرف و بزرگی کے لئے نہایت ضروری ہے، کہ وہ حد درجہ جنگ جو سنگ دل اور شہوت راں ہو، اسی ذہنیت میں ہماری حدیثیں وضع کی گئی ہیں اور راویوں کو آنحضرت کو اس رنگ میں دکھلانے میں خاص مزہ آتا ہے۔''

مجھے سخت حیرت ہے کہ ایک مدعی اسلام جس کو متبع قرآن اور حقیقی مسلم ہونے کے دعویٰ کے ساتھ تاریخ کی پوری واقفیت کا بھی دعویٰ ہے، اس کے قلم سے مذکورہ بالا الفاظ کس طرح نکلے، حالانکہ اسلام کا ایک دشمن بھی اگر وہ شریف ہو تو ان کے لکھنے سے اس لئے پرہیز کرے گا کہ اس میں اس کے علم و واقفیت، اس کے انصاف و دیانت اور اس کی صداقت و راستی کی سخت توہین ہے، اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں سے اگر صحابہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں تو ''حق گو'' صاحب کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہئے، اس لئے کہ ان کے اس رافضیانہ حملہ کی زد حدیث پر نہیں، بلکہ براہ راست قرآن کریم پر پڑتی ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو مدح سرائی قرآن کریم میں کی گئی ہے، اس سے کوئی واقف قرآن بے خبر نہیں ہے، اور اگر تابعین واتباع تابعین مراد ہیں، تو یہ ان کی جہالت اور تاریخ سے ناواقفیت ہے، تاریخیں شاہد ہیں کہ ان کا دامن اخلاق

ان گندگیوں سے پاک تھا، بعض بعض افراد اگر ان بداخلاقیوں کے مرتکب ہوں تو ان کی وجہ سے پوری جماعت کو متہم کرنا صریح ظلم ہے، اگر ''حق گو'' صاحب کہیں کہ میں ساری قوم کو متہم نہیں کرتا، بلکہ ان میں بعض ہی افراد کی ذہنیت خراب ہوئی اور انہی نے حدیثیں وضع کیں، تو میں کہوں گا کہ یہ بات نہایت بعید از قیاس ہے، کہ چند سنگدل اور شہوت ران اشخاص ایک بات رسول پاک ﷺ پر افتراء کریں، اور اہل علم وصلاح کی جماعت اس کو قبول وتسلیم کرلے، حالانکہ اس جماعت کا اصول یہ ہے کہ جس کی پابندی شریعت یا راست بازی میں ادنیٰ اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کی روایتوں کو قبول نہیں کرتی، کتب جرح وتعدیل میں اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں۔

کیا یہ قرآن کا انکار نہیں ہے؟

پھر غور تو کیجئے، کہ قرآن میں امت محمدیہ کو خیر الامم کا لقب عطا کیا گیا، اس کا امتیازی وصف نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا بتایا گیا ہے لیکن اگر اوائل صدی ہجری ہی کے مسلمان جنگ جو، سنگ دل اور شہوت ران تھے، اور ان اوصاف رذیلہ کو محبوب بنانے کے لئے رسول پاک ﷺ کو بھی ان اوصاف سے متہم کرتے تھے، تو مجھے ''حق گو'' صاحب بتائیں، کہ اس قوم کو خیر الامم کا لقب دینا کیونکر جائز ہوسکتا ہے، اور وہ نیکی کی بات بتانے والی اور برائی سے روکنے والی کیسے ہوسکتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ''حق گو'' صاحب ظاہر میں اگرچہ صرف حدیثوں کے منکر ہیں، مگر درپردہ قرآن کے بھی سخت مخالف ہیں۔

دشمنان اسلام کی بدگوئیوں کی صدائے بازگشت

اس کے بعد مسلمانوں کے آقا ومولی ﷺ کی شان عالی میں دشمنان اسلام نے جو گستاخیاں کی ہیں ''حق گو'' صاحب انکا اعادہ کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کے نزدیک جملہ علمائے اسلام تو افتراء پرداز شہوت پرست اور عظمت وحرمت رسول اللہ

ﷺ کے احساس سے بے بہرہ تھے، لیکن ان کے یورپین مقتدا اور پیشوا بالکل سچے اور معصوم ہیں فرماتے ہیں:

> ”اس میں شک نہیں کہ اگر حدیث کی روایتوں کو صحیح مان لیا جائے تو آنحضرت باوصف اس کے کہ سن رسیدہ تھے، اور اپنی ساری جوانی کو ایک بوڑھی بیوہ کے ساتھ گزار چکے تھے ① ایک رات میں اپنی تمام بیویوں کے پاس ہو آتے تھے ② ہمیشہ خوبصورت عورتوں کو نکاح میں لانے کے خواہش مند رہتے تھے ③ جو بیوی جوانی سے ڈھل چکی ہوتیں، ان کو آپ طلاق دینے پر تیار ہو جاتے ④ کسی اجنبی عورت کا حسن دیکھ کر بے قرار ہو جاتے اور گھر پر آکر اپنی بیوی سے جو سامنے آجاتی، اگرچہ وہ کام کاج میں مشغول ہوتی حاجت برآری کر لیتے ⑤ خلاف وقت اپنی بیویوں کے پاس چلے جاتے اور اس پر بیویوں میں خوب جھگڑا ہوتا۔“

ہمارے ناظرین اس اقتباس کو اپنی طبیعت پر جبر کر کے پڑھیں، اور انصاف سے کہیں کہ کیا ”حق گو“ صاحب نے بد باطن عیسائیوں اور کمینہ فطرت آریوں کی ہو بہو نقل نہیں اتاری ہے، ہاں اگر فرق ہے تو یہ کہ عیسائی اور آریہ ایک حد تک معذور ہیں، اس لئے کہ ان کو اسلامی لٹریچر سے واقفیت بہت کم اور ان کے مذہبی معلومات نہایت محدود اور صحیح و غلط کی تمیز یکسر مفقود ہے، دوسرے وہ اپنی تیرہ درونی اور اس بغض و عداوت کی وجہ سے بھی جو ان کو اسلام و داعی اسلام علیہ السلام سے ہے، جھوٹ بولنے اور بے سروپا الزام تراشنے اور آنحضرت ﷺ کی شان میں دریدہ دہنی کرنے پر مجبور ہیں، اور ”حق گو“ صاحب اسلام کے مدعی اسلامی معلومات کا خزانہ اور اسلام و داعی اسلام علیہ السلام کے ”جاں نثار“ ہیں اس لئے وہ کسی طرح معذور نہیں ہیں۔

افسوس

گر مسلمانی ہمیں است کہ حق گو دارد
وے اگر در پس امروز بود فردائے

”حق گو“ اپنی اصل شکل میں

”حق گو“ صاحب اپنی زبان سے چاہے جو کچھ کہیں مگر اقتباس مذکورہ بالا ان کے دلی جذبات کی صاف پردہ دری کر رہا ہے، اور ہر چند کہ انہوں نے ہوشیاری سے اپنا گناہ حدیثوں اور ان کے راویوں کے سر تھوپ دیا ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں، کہ جو الزامات انہوں نے قائم کئے ہیں ان میں سے اکثر کا کوئی نشان حدیث میں نہیں ہے، تو صاف کھل جاتا ہے کہ حقیقت میں تو ان کو اپنے عیسائی اور آریہ دوستوں کی ہمنوائی اور ان کی رضا جوئی مقصود تھی، لیکن ان باتوں کو اپنے نام سے لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی، تو جھوٹ موٹ حدیثوں کے نام سے ان کو لکھ دیا۔

”حق گو“ کو چیلنج

اگر ”حق گو“ صاحب کو ہماری بات سے انکار ہو تو ہم ان کو چیلنج دیتے ہیں کہ انہوں نے الزامات نمبر ۲، ۳، ۴، ۵ کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا حوالہ دیا ہے، لہٰذا وہ کتب احادیث سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ان روایات کو نقل کر کے ان کے لفظی ترجمہ کے ساتھ بلا کسی تحریف کے شائع کر دیں۔

گستاخانہ اعتراضات کا دندان شکن جواب

میں تسلیم کرتا ہوں کہ حضرت جویریہ اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہما سے آپ نے نکاح کیا، اور یہ بیبیاں بے شبہہ خوبصورت بھی تھیں لیکن روایات میں یہ تو کہیں بھی مذکور نہیں ہے کہ آپ نے معاذ اللہ ان کے حسن پر فریفتہ ہو کر نکاح کیا، بلکہ اس کے برخلاف روایات میں بصراحت مذکور ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے اپنے باپ سے

خود ہی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔[1] اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ یہ ہے، کہ وہ رئیس بنی نضیرحی بن اخطب کی بیٹی تھیں جب وہ گرفتار ہو کر آئیں تو آنحضرت ﷺ کو خیال ہوا کہ اگر یہ کسی کی باندی اور کنیز بنا دی گئیں، تو اس کو اپنی سخت بے عزتی سمجھیں گی، اس لئے ان کو نکاح کا پیغام دیا، انہوں نے منظور کر لیا۔

اس سلسلہ میں آپ نے عمرہ بنت جون کا نام بھی لیا ہے، حالانکہ ان کے قصہ میں بھی بصراحت مذکور ہے کہ ان کے باپ نے خود بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ آپ میری لڑکی سے نکاح کر لیجئے اور یہ بھی ظاہر کیا کہ لڑکی بھی یہ شرف حاصل کرنے کی آرزو مند ہے۔[2] اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ ''حق گو'' صاحب کے الزام نمبر۲ کی کوئی بنیاد حدیثوں میں نہیں ہے، بلکہ اس کو انہوں نے محض اپنی جہالت کی بنا پر یا اپنے غیر مسلم دوستوں کی تقلید وحمایت میں لکھ دیا ہے۔

یہی حال الزام نمبر۳ کا بھی ہے، حدیثوں میں صرف اتنا مذکور ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا جب بوڑھی ہوئیں، تو انہوں نے خود آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ آپ میرے لئے باری مقرر نہ کیجئے میں اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کرتی ہوں، حضور ﷺ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی۔[3] صحیح روایتوں میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے، پھر یہ قصہ بھی تنہا حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ پیش آیا، پس معلوم نہیں کہ ''حق گو'' صاحب کو کیا عناد ہے کہ انہوں نے ایک بے بنیاد الزام تراش لیا اور اس کو ایسے الفاظ میں لکھا کہ جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ اکثر ہوتا رہتا تھا۔ (توبہ توبہ)

اور یہی کیفیت الزم نمبر۴ کی بھی ہے، کتب حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

---

[1] اصابہ حالات جویریہ اور سیرۃ النبی شبلی

[2] فتح الباری: ۲۸۷/۵ [3] مسلم: ۴۷۳/۱، بخاری: ۷۸۵/۲

اس مضمون کی کوئی روایت ہی نہیں ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے البتہ ایک روایت ہے، جس میں آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے، کہ جب تم کسی عورت کو دیکھو اور تمہارے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو جائے تو اپنی بی بی کے پاس چلے جایا کرو، اس وسوسہ کا علاج ہو جائے گا، لیکن اس روایت میں کسی عورت کے حسن کو دیکھ کر آنحضرت ﷺ کا بے قرار ہو جانا معاذ اللہ مذکور نہیں ہے، اگر ''حق گو'' صاحب نے کسی عناد کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی مقدس شان میں یہ گستاخی نہیں کی ہے، تو کیا وہ کسی روایت میں مذکورۂ بالا بے ہودہ الفاظ دکھا سکتے ہیں۔

اور یہی نوعیت پانچویں الزام کی ہے، ''حق گو'' صاحب نے اس الزام میں حضرت زینب اور حفصہ و ماریہ رضی اللہ عنہن کے واقعات کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ حدیثوں سے یہ واقعات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا سرے سے کوئی ایسا واقعہ مذکور ہی نہیں ہے، اور حفصہ اور ماریہ رضی اللہ عنہما کا جو قصہ دشمنان اسلام آنحضرت ﷺ کی اہانت شان کے لئے ذکر کیا کرتے ہیں اس کا بھی صحیح روایات میں کوئی نشان موجود نہیں، چنانچہ صحاح ستہ جو حدیث کے صحیح و مستند ترین مجموعے ہیں، ان میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی باری میں حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے پاس جانے کا کسی جگہ اشارہ تک نہیں ہے، اور طبری وغیرہ کی بعض روایات میں جو قصہ مذکور ہے، اس کی نسبت عینی شرح بخاری (جلد ۹ صفحہ ۵۴۸)، نووی شرح مسلم (جلد ۱ صفحہ ۴۷۹) میں مصرح ہے، کہ ''ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کا یہ قصہ کسی صحیح طریقہ سے وارد نہیں ہوا۔'' اور یہی بات قاضی عیاض نے بھی شرح مسلم میں کہی ہے۔[1] اور زمانہ حال کے نامور مورخ شبلی نعمانی کی بھی یہی تحقیق ہے، پس ایسی ناقابل اعتبار روایات کو دکھا کر جن کو حدیثوں کے ماننے والے خود کمزور اور بے اصل بتا رہے ہیں، سارے ذخیرہ احادیث کی نسبت بدگمانی پھیلانا کہاں کی دیانت ہے۔

---

[1] نووی: ٤٧٩/١

اس مختصر بیان سے آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا، کہ ''حق گو'' صاحب کے چار الزامات تو بالکل بے بنیاد اور محض اتہام ہیں، اب رہی ان کی پہلی بات تو وہ بلا شبہہ حدیث سے ثابت ہے لیکن اس کو شہوت پرستی کہنا انتہائی نادانی اور پرلے درجہ کے بے انصافی ہے، افسوس ہے کہ ''حق گو'' نے الفاظ تو ضرور رٹ لئے ہیں، لیکن ان کے معانی سے قطعاً بے خبر ہیں، حیرت ہے کہ ان کو آج تک یہ خبر ہی نہیں کہ جائز محل میں جائز طریق پر طبعی خواہش کا پورا کرنا شہوت پرستی نہیں کہلاتا ہے، ورنہ پھر ''حق گو'' صاحب کے قول پر تو کوئی انسان شہوت پرستی سے خالی نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم نے بی بی اور کنیز سے حاجت برآری کی صریح اجازت دے کر یہ فرمایا ہے کہ بی بیوں اور کنیزں کے ساتھ خواہش پوری کرنے میں کوئی ملامت والزام نہیں ہے، لیکن ''حق گو'' صاحب کے نزدیک اس صورت میں بھی الزام ہے، کہئے ''حق گو'' صاحب کیا آپ حدیثوں کا انکار کر کے قرآن میں بھی اصلاح دینے لگے، کیا قرآن قریم کی ان آیتوں کے اطلاق وعموم سے یہ مستفاد نہیں ہوتا کہ اگر متعدد بیبیاں ہوں، اور ان سب کے پاس ایک ہی دن میں ہو آئے تو بھی ملامت نہیں ہے؟

پھر ''حق گو'' صاحب نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ قرآن نے ہر مؤمن کے لئے چار چار عورتوں سے نکاح کرنے کی صراحۃً اجازت دی ہے اور ہر عورت کے لئے علیحدہ علیحدہ باری مقرر کرنے کا کوئی حکم بیان نہیں کیا ہے، پس اگر کوئی شخص چار عورتوں سے نکاح کر کے سب کے پاس ایک ہی شب میں چلا جائے تو وہ قرآنی حکم کی رو سے شہوت پرست کہلائے گا یا نہیں، اگر ''حق گو'' صاحب کہیں کہ وہ شہوت پرست ہے، تو مہربانی کر کے وہ مجھے بتائیں کہ یہ حکم قرآن کی کس آیت میں مذکور ہے، اور جب کہ قرآن نے باری کا مسئلہ بیان نہیں کیا تو شخص مذکور شہوت پرست کیوں کہا جائے گا، اور اگر ''حق گو'' صاحب کہیں کہ وہ شہوت پرست نہیں ہے، تو بتائیں کہ الزام نمبر ۱۰ میں جس حدیث کا حوالہ انہوں نے دیا ہے، اس کو پھر کیوں

مطعون کرتے ہیں۔

اسی طرح تاریخوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے نو بیبیاں تھیں، اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو سورۂ احزاب میں یہ اجازت دی ہے کہ:

> ”اپنی ان بیبیوں میں سے جن کو چاہئے اپنے نزدیک کیجئے، اور جن کو چاہئے دور رکھئے۔“

پس اگر آنحضرت ﷺ نے اپنی جملہ ازواج مطہرات کو کسی مصلحت سے ایک ہی رات میں اپنے نزدیک کر لیا تو ”حق گو“ صاحب بتائیں کہ اس آیت قرآنی سے اس فعل کا جواز ثابت ہوتا ہے، یا نہیں، اگر کہئے کہ نہیں تو میں کہوں گا کہ کیوں کیا قرآن نے کسی آیت میں آنحضرت ﷺ یا عامہ مؤمنین کے لئے باری مقرر کرنا ضرور قرار دیا ہے، اور ایک دن یا رات میں سب بیبیوں سے صحبت کرنے کو ناجائز یا ”شہوت پرستی“ کا مرادف بتایا ہے، یا قرآن نے اسی مذکورہ بالا آیت میں آنحضرت ﷺ کو یہ حکم دیا ہے کہ اپنی ازواج رضی اللہ عنہن کو باری باری سے علیحدہ علیحدہ راتوں میں اپنے نزدیک کیجئے؟ سو اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہیں ہے، تو یقیناً آیت بالا سے فعل مذکور کا جواز ثابت ہوگا اور اگر کہئے کہ ہاں فعل مذکور کا جواز آیت سے نکلتا ہے تو پھر آپ نے حدیث ہی کو نشانہ طعن کیوں بنایا، اپنے پیشتر غیر مسلموں کی طرح آیت ہی کی نسبت زہر افشانی کیوں نہیں کی؟

نوٹ: واضح ہو کہ یہ تقریریں تمام تر الزامی ہیں، اور اگر قائلین حدیث کو مسئلہ قسم کی وجہ سے اشکال پیش آئے، تو اس کا حل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر باری مقرر کرنا واجب نہ تھا، اور اگر واجب بھی ہو تو ایک دورہ کے ختم ہونے اور دوسرے کے شروع ہونے سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا ہوگا، جس کی باری اس دن تھی اس کی اجازت سے ایسا ہوا تھا۔[1]

---

[1] نووی، فتح الباری

اس عنوان کے ماتحت ''حق گو'' صاحب کی دوسری زہر افشانی

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب لکھتے ہیں:

> ''اسی طرح آپ کے مغازی میں کوئی بات ایسی نہیں ہے، جس کا الزام حدیثوں نے اور اس سے زیادہ واقدی نے آپ پر نہ لگایا ہو یعنی بوڑھے ناتواں کو قتل کرانا، بچوں والی ماں کو قتل کرانا، جنگ خیبر میں لوگوں کو آگ سے عذاب دینا کہ خزانہ کا پتہ بتائیں، کھیتوں اور مکانوں کو برد بار کرنا لوگوں کو تہ تیغ بیدریغ کرانا، ان کی عورتوں کو بلا نکاح لوگوں کے حوالہ کر دینا۔ ''

''حق گو'' صاحب کی جرأت قابل داد ہے، کہ حدیثوں کو مطعون کرنے کے لئے اتنی ساری باتیں لکھ ڈالیں، لیکن حوالہ ایک کا بھی نہ دیا، حالانکہ آپ کو چاہئے تھا کہ جس طرح یہ بے سروپا باتیں آپ نے دل سے گھڑ لی ہیں، ان کے لئے غلط حوالے بھی تراش لیتے ''حق گو'' صاحب اس افتراء پردازی و بہتان طرازی سے آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے، جب کہ خود صحاح میں ذیل کی حدیثیں آپ کی تکذیب کے لئے موجود ہیں۔

''حق گو'' کے افتراؤں کا جواب بروئے احادیث

① ابوداؤد (جلد۲ صفحہ۲۵۹) میں بروایت انس رضی اللہ عنہ ارشاد نبوی ﷺ ہے، ''ولا تقتلوا شیخًا فانیًا ولا طفلاً ولَا صَغِیرًا ولا امرأۃ'' (یعنی) کسی ناتواں بوڑھے کو قتل نہ کرنا، نہ کسی بچے کو، نہ کسی کم عمر والے نابالغ لڑکے کو، نہ کسی عورت کو، اور بخاری (جلد۲ صفحہ۴۲۳) میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے

عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا، اور ابوداؤد و دیگر کتب صحاح میں ہے، کہ کسی لڑائی میں آنحضرت ﷺ نے کسی عورت کو مقتول پایا، تو بڑی ناگواری ظاہر فرمائی۔

ان حدیثوں سے ''حق گو'' صاحب کی پہلی اور دوسری بات کے بے سر و پا اور افتراء ہونا آفتاب کی طرح روشن ہے۔

② حدیثوں میں کوئی ایسا واقعہ مذکور نہیں ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے جنگ خیبر میں خزانہ چھپانے والوں کو آگ سے عذاب دیا، بلکہ اس کے برخلاف ابوداؤد میں مذکور ہے، کہ حی بن اخطب کے بھائی سعیہ سے آنحضرت ﷺ نے خزانہ کی نسبت دریافت کیا، اور اس نے چھپایا، لیکن اس کا کچھ ذکر نہیں ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے اس کو کوئی معمولی ہی سزا دی، اور بعض لوگ جو یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ کنانہ یہودی اسی جرم میں مارا گیا، تو یہ بالکل غلط ہے، کنانہ محمود بن مسلمہ کے قصاص میں مارا گیا ہے، جیسا کہ تاریخ طبری میں مصرح ہے، اور یوں بھی یہ بات لغو معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ اگر کنانہ کا یہی جرم تھا، کہ اس نے خزانہ چھپایا تھا، تو یہ جرم سعیہ نے بھی کیا تھا، جیسا کہ ابوداؤد میں مصرح ہے، لیکن اس کی سزا یابی یا قتل کا ذکر کوئی نہیں کرتا، بہر حال حدیثوں میں اس الزام کا کوئی نشان نہیں۔

③ کھیتوں کے برباد کرنے کا کوئی واقعہ حدیثوں میں مذکور نہیں ہے، ہاں غزوہ بنی نضیر میں لینہ (ایک قسم کی کھجور) کے کچھ درخت کٹوانے اور ان کے جلوانے کا ذکر ضرور ہے، لیکن یہ تنہا حدیثوں میں نہیں، بلکہ قرآن مجید میں بھی مذکور ہے، اور خدا تعالیٰ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے بجائے اظہار ناراضی کے اپنی رضا مندی کا اظہار فرمایا ہے، کہ یہ سب ہماری اجازت و خوشی سے ہوا ہے، سورہ حشر میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''وَمَا قطعتم مِنْ لِينَةٍ اوْتر كتمُوهَا قائمةً عَلى اصُولها فباذن اللّٰه وليخزى الفاسقين'' (یعنی) تم نے لینہ کے جو درخت کاٹے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، تو یہ سب اللہ کے حکم سے تھا، اور تا کہ خدا فاسقوں کو ذلیل و رسوا

کرے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عفو عام اور کرم بے پایاں

④ لوگوں کو تہ تیغ بے دریغ کرانا بھی حدیثوں سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ وہ آپ کے عفو عام اور کرم بے پایاں کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں، غزوۂ بدر، غزوہ بنی مصطلق، فتح مکہ اور ہوازن کے اسیروں کے حالات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر کتب احادیث میں پڑھئے، اور میری تصدیق کیجئے۔

توریت کی شہادت

اور اگر کسی شخص کو یہود بنو قریظہ کے واقعات سے دل میں خلجان پیدا ہو، تو وہ توریت کتاب استثناء کی یہ آیتیں پڑھے۔

> ”اور جب تو کسی شہر کے پاس ان سے لڑنے کے لئے آپہنچے، تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر، تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور، اور دروازہ تیرے لئے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے، تیری خراج گزار ہوگی، اور تیری خدمت کرے گی، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو اس کا محاصرہ کر، اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے، تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مویشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لئے لے۔“ لہ

اس سے اس کو یقین ہو جائے گا کہ یہود بنی قریظہ کو جو سزا دی گئی، وہ بعینہ ان کی شریعت کے مطابق تھی، چنانچہ اسی وجہ سے سردار بنی قریظہ نے اپنے قتل سے پہلے یہ کہا کہ۔

لہ کتاب استثناء ب ۲۰

''یہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہی حکم الٰہی تھا، اور ایسا ہی لکھا ہوا تھا۔''[1]

⑤ کافروں کی اسیر عورتوں کو کنیز بنانے کا الزام بھی نہایت بے ہودہ الزام ہے، تاریخ شاہد ہے کہ یہ دستور نہایت قدیم ہے، اور مہذب سے مہذب حکومتوں میں اس کا رواج ہمیشہ رہا ہے، اور اگلی شریعتوں نے بھی اس کو جائز رکھا ہے، چنانچہ توریت کی کتاب استثناء کے باب ۲۱ میں اس کی اجازت بصراحت مذکور ہے، لہٰذا اتنا مذہب اسلام کو نشانۂ ملامت بنانا (جیسا کہ غیر مسلموں نے کیا ہے) سخت بے انصافی و بد دیانتی ہے، اور اس سے زیادہ بے انصافی حدیثوں کو مطعون کرنا ہے (جیسا کہ ''حق گو'' نے کیا ہے) اس لئے کہ قرآن کریم نے متعدد مقامات میں ''اَوْ مَا ملکت ایْمَانکُمْ'' کے عنون سے کنیزوں سے نفع اٹھانے کو جائز و مباح قرار دیا ہے، اور سورۂ احزاب میں اس کے ساتھ ''مِمّا افاء اللّٰه عليْك'' کے الفاظ بھی ہیں، جو خاص ان چیزں کے لئے استعمال ہوتے ہیں، جو جنگ میں غنیمت کے طور پر حاصل ہوتی ہیں۔

عرنیین کا واقعہ

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب نے عرنیین کا واقعہ صحیحین سے نقل کر کے لکھا ہے:

> ① ''ڈاکٹر زویمر ایک متعصب امریکن مشزی نے اس روایت کو ہو بہو فوٹو سے چھاپا ہے ② ایک ایسا شخص جو جانور کے وحشیانہ ذبح اور تیر باراں کرنے پر سختی سے منع کرتا ہے، اور اس وقت جب کہ آپ کے چچا حمزہ کا میدان احد میں مثلہ کیا گیا، بدلہ نہیں لیتا، وہ ایک انسان کو ایسی بے دردی سے قتل کرائے ناممکن ہے ③ اس روایت کے متن اور اسناد میں اختلاف وتناقض ہے ④ یہ روایت صرف حضرت انس سے مروی

---

[1] طبری

ہے، دوسرے کسی صحابی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ⑤ اس روایت میں پیشاب پینے کا حکم دینا بھی مذکور ہے، تو کیا حضور ﷺ ناپاک اور حرام چیزوں کے استعمال کا بھی حکم دیتے تھے۔“

امر اوّل کا جواب

”حق گو“ صاحب یورپ و امریکہ سے ایسے مرعوب ہیں، کہ جس بات کو کسی یورپین یا امریکہ نے معیوب کہہ دیا، وہ اس کو معیوب اور قابل نفرت سمجھنے لگتے ہیں، لیکن یہ مرعوبیت یا تقلید جامدان ہی کو مبارک ہو، مسلمانوں کے نزدیک حسن و قبح کا واحد معیار خدائے تعالیٰ و رسول ﷺ کا استحسان و استہجان ہے، زویمر نے اگر اس روایت کو فوٹو سے چھاپا تو یہ اس کی بے عقلی و بددیانتی ہے، اور اس کو ”متعصب امریکن مشنری“ جانتے ہوئے آپ کا اس کی اس حرکت سے متاثر ہونا اور اس حدیث کا انکار کر دینا بھی سخت نافہمی ہے، آپ کو عقل سے کام لینا چاہئے تھا، کہ متعصب عیسائی قرآن کریم، رسالت آنحضرت ﷺ اور اسلام میں سے کس چیز پر حرف گیری نہیں کرتے، اور ان میں سے کس کا مضحکہ نہیں اڑاتے، تو کیا آپ ان چیزوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے؟

عیسائی اپنے گھر کی خبر لیں

آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ زویمر کو اس روایت پر حرف گیری کا کیا حق حاصل تھا، جب کہ عہد نامہ قدیم کی متعدد کتابوں میں مرتد کے قتل کا صریح حکم موجود ہے[1] اور کتاب خروج ب ۳۲ میں بنی اسرائیل کے ارتداد اور گوسالہ پرستی کے قصہ میں مذکور ہے:

”تب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہوئے، اور اس نے انہیں کہا، کہ

---

[1] کتاب استثناء ب ۱۷ اور ب ۱۳ اور کتاب احبار ب ۲٤

> خداوند، اسرائیل کے خدا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکر گاہ میں گزرتے پھرو، اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک اپنے دوست اور ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے، اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے مطابق کیا، چنانچہ اس دن لوگوں میں قریب تین ہزار مرد مارنے پڑے، اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لئے اپنے تئیں مخصوص کرو ہر ایک مرد اپنے بیٹے اور اپنے بھائی پر حملہ کرے، تاکہ وہ آج تمہیں برکت دے۔"

زویمر کو انصاف کی ہوا لگی ہوتی تو سات آٹھ مرتدین کے بجائے ان تین ہزار آدمیوں کے "نہایت بے دردی" سے صرف ایک دن میں قتل کئے جانے کا فوٹو کھینچ کر بتاتا کہ یہ اس عہد قدیم کی تعلیم ہے جس کو جاری کرنے کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں آئے تھے، آخر یہ کیا کہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا تو نظر آتا ہے، لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا؟

امر ثانی پر گفتگو

"حق گو" صاحب! ہوش میں آیئے، حدیثوں کا انکار کرنے کے بعد آپ کے لئے ممکن نہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانوروں کے وحشیانہ ذبح اور تیر باراں کرنے سے منع کرنا، اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مثلہ کا بدلہ نہ لینا بیان کرسکیں یہ سب باتیں تو حدیث ہی کی بدولت معلوم ہوسکتی ہیں۔ اور اس کے آپ منکر ہیں۔ لہٰذا یا تو انکارِ حدیث سے توبہ کیجئے، یا ان باتوں کا ذکر چھوڑ یئے، کہئے اب تو آپ کے لئے حدیث حلق کی ہڈی ثابت ہوئی ہوگی، کہ اگلتے بنے نہ نگلتے بنے، بہر حال خوب سوچ کر جواب دیجئے، اور اس کے بعد اپنی دوسری بدحواسی ملاحظہ کیجئے، کہ آپ عرینین کے

قتل کو ''بے دردانہ انتقام'' سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ آپ نے خود ہی عرینین کے واقعہ میں نقل کیا ہے کہ:

''① وہ مرتد ہوگئے (یعنی مسلمان ہونے کے بعد دین سے پھر گئے)

اور ② آنحضرت ﷺ کے چرواہے کو مار ڈالا ③ اور اونٹوں کو بھی

ہانک لے گئے۔''

یعنی انہوں نے تین بڑے جرم کئے تھے، ارتداد اور قتل ناحق، اور ڈاکہ زنی، ان میں سے تنہا ارتداد اتنا بڑا جرم ہے، جس کا اور کوئی جرم مقابلہ نہیں کرسکتا، اور ہر شریعت میں اس کی سزا قتل قرار دی گئی ہے، تورات کی تصریحات پہلے آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

سزائے ارتداد اور قرآن

توریت کے اسی واقعہ کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِ كُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝﴾

تَرجَمَہ: ''(یعنی) اور یاد کرو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا، اپنے خالق کی بارگاہ میں توبہ کرو، کہ اپنے لوگوں کو قتل کرو، یہ تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک اچھا ہے، وہ بہت توجہ کرنے والا مہربان خدا ہے۔''

دیکھئے قرآن نے بھی ارتداد کی سزا قتل ہی بتائی ہے، لیکن چونکہ آپ جیسے تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہے، اور کفر و شرک کوئی جرم نہیں ہے،

(حالانکہ اگر آپ حقیقۃً قرآن کے متبع ہوتے، تو شرک سے بڑھ کر آپ کے نزدیک کوئی جرم نہ ہوتا، کہ خدا فرماتا ہے ''اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ'' یعنی شرک بے شبہہ بہت بڑا ظلم ہے) اس لئے اس جرم کو کوئی اہمیت بھی نہ دیجئے، تو باقی دو جرم ہی کیا کم ہیں، قتل ناحق کے بدلے قتل، اسی طرح راہزنی کی سزا میں راہزن کی گردن اڑا دینا سولی دینا، اور الٹے ہاتھ پاؤں کاٹنا قرآن کا صریح حتمی حکم ہے، قتل ناحق کے باب میں ''کتب عَلَيْكُمُ القِصَاصُ فِى القتلى'' وغیرہ کی تلاوت کیجئے۔

راہزنوں کی سزا

اور راہزنوں کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْا اَوْ يُصَلَّبُوْا اَوْ تَقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا﴾

کیا قرآن کے اس حکم کے بعد بھی عرینین کے قتل کو بے دردانہ انتقام کہیں گے؟ کیا قرآن نے ان مجرموں کے ساتھ ہمدردی کی تعلیم دی ہے؟ اچھا قرآن نہیں، دنیا میں کسی قانون ملکی نے ایسے مجرموں کے ساتھ ہمدردی کو جائز رکھا ہے، کیا آپ نے کسی حکومت کی تاریخ میں پڑھا ہے، کہ اس نے خونیوں، حکومت کے باغیوں اور ڈاکوؤں کو جاگیریں خلعتیں اور منصب دیئے ہوں؟ اگر نہیں تو پھر یہ حدیث آپ کی آنکھوں میں کیوں کھٹک رہی ہے۔

عرینین کی سفاکیان

اس کے بعد سنئے کہ عرینین نے ایک ہی نہیں بلکہ کئی چرواہوں کو قتل کیا تھا[1] اور

---

[1] مسلم: ٢/٥٧، نسائی: ٢/١٦٧

صحیح ابن حبان میں ”ثم مالوا علی الرعاۃ فقتلوھم“ (یعنی عرینین چرواہوں کی طرف جھکے، اور ان کو مار ڈالا) اور انہوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں گرم سلائیاں بھی پھیریں تھیں، مسلم (جلد۲ صفحہ۵۸)، ترمذی (صفحہ۳۶)، نسائی (جلد۲ صفحہ۱۶۸) میں حضرت انس ؓ کا بیان ہے، ”انّما سَمَلَ النبیُّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اعینھُم لَانّھُم سَمَلُوا اعین الرعاۃ۔“ (یعنی) آنحضرت ﷺ نے عرنیوں کی آنکھوں میں سلائی اس لئے پھروائی کہ انہوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیریں تھیں۔ اور سیر کی کتابوں میں یہ تصریح بھی ہے کہ انہوں نے چرواہوں کو مارا تھا، بعینہٖ ایسی ہی سزا ان کو دی گئی تاکہ پھر ان حرکات ناشائستہ کی جرأت کوئی نہ کرے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد کسی کو ایسی سزا آپ نے نہ دی۔

مثلہ کرنے سے حضور ﷺ کی ممانعت

بلکہ اس کے بعد خطبہ میں آنحضرت ﷺ نے مثلہ کی برائیاں بیان کیں، اور سختی سے اس کو ممنوع قرار دیا، جیسا کہ خود حضرت انس ؓ نے بیان کیا ہے۔[1]

غیر موذی بے زبان جانوروں پر خونی اور ڈاکو عرنیوں کو قیاس کرنا بھی ”حق گو“ صاحب ہی کی عقل جائز رکھتی ہے، اسی طرح حضرت حمزہ ؓ کے مثلہ پر بھی غریبوں کے ظلم وستم کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ اولاً تو مرتد اور اصلی کافر کے احکام جدا جدا ہیں، ثانیاً آنحضرت ﷺ اس ظلم وستم کا انتقام نہ لیتے تھے، جس کا تعلق براہ راست آپ سے ہو، حضرت حمزہ ؓ کی مظلومیت اسی قسم سے تھی، لیکن دوسرے مسلمانوں پر جو ظلم وستم ہوتا تھا، اس کی واجبی سزا ظالموں کو ضرور دیتے تھے، اس لئے کہ اگر ایسا نہ کرتے، تو مظلومین کی دادرسی نہ ہوتی، اور نہ ظالموں کی عبرت ناک سزا دیکھ کر دوسرے لوگ ظلم سے باز رہتے، عرینین کا ظلم اسی قبیل سے تھا، اس لئے ان کو

---

[1] ابوداؤد، نسائی

سزا دینا ضروری اور واجب تھا، آدمی اپنے حقوق چھوڑ دے، اور معاف کر دے، لیکن دوسروں کے حقوق کو معاف کرنے کا اس کو حق نہیں ہے۔

امر ثالث پر بحث

''حق گو'' صاحب نے اس روایت کے متن و اسناد کے اختلاف کا جو ذکر کیا ہے، وہ ان کی ناواقفیت کی بین دلیل ہے، متن میں انہوں نے یہ اختلاف دکھایا ہے کہ کہیں ان کو پیاسا تڑپا کر مارنا مذکور ہے، اور کہیں آنکھوں میں کانٹے چبھونے کا ذکر ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کو اختلاف بیانی کہنا ناسمجھی ہے، بات یہ ہے کہ عرینین کے ساتھ یہ دونوں معاملے ہوئے تھے، مگر راویوں نے جب قصہ کو مختصر کر کے بیان کیا تو کسی نے یہ جزو حذف کر دیا، اور کسی نے وہ جزو حذف کر دیا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن روایتوں میں تفصیلی بیان ہے، ان میں دونوں باتیں مذکور ہیں۔[1] اور اسناد میں یہ اختلاف دکھایا ہے کہ:

ایک جگہ ہے ''محمد بن الصلت، حدثنا الولید حدثنا الاوزاعی عن یحییٰ عن ابی قلابة عن انس'' دوسری جگہ ہے ''موسی بن اسمٰعیل عن وھب عن ایوب عن ابی قلابة'' لیکن یہ بھی کوئی اختلاف نہیں ہے، قصہ یوں ہے کہ ابو قلابہ کے دو شاگرد ہیں، ایک ایوب دوسرے یحییٰ اور ان دونوں نے ابو قلابہ سے اس حدیث کو سنا ہے، پھر ایوب سے وہیب نے اور ان سے موسیٰ بن اسمٰعیل نے اس حدیث کو سنا ہے، اور یحییٰ سے اوزاعی نے، اور اوزاعی سے ولید نے اور ولید سے محمد بن الصلت نے سنا، پھر بخاری موسیٰ اور محمد بن الصلت دونوں کے شاگرد ہیں، اور ان دونوں سے انہوں نے اس حدیث کو سنا ہے، اس لئے کہیں موسیٰ کے واسطہ سے ان کی بیان کی ہوئی روایت ذکر کرتے ہیں، اور کہیں محمد بن الصلت کے واسطہ سے اس روایت کو ذکر کرتے ہیں، مجھے افسوس ہے کہ فن کی ایسی معمولی اور

---

[1] نسائی: ۲/۱۶۶، ۱۶۷

کثیر الوقوع بات بھی ''حق گو'' صاحب کو سمجھانی پڑتی ہے ؎

ذوق بازیچۂ نہلان ہے سراسر یہ زمین
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

''حق گو'' صاحب آپ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ پروفیسر براؤن کی کوئی تحقیق آپ سے ان کے دو شاگرد نکلسن اور اسمتھ بیان کریں اور آپ اس تحقیق کو نقل کرنے کے وقت کبھی یوں کہیں کہ مجھ سے اس کو نکلسن نے بیان کیا، اور کبھی کہیں کہ مجھ سے اسمتھ نے بیان کیا، تو اس کو اختلاف بیانی نہ کہیں گے، بلکہ کہا جائے گا، کہ دونوں بیان صحیح ہیں۔

امر رابع پر گرفت

یہ بھی ''حق گو'' صاحب کی لاعلمی اور انتہائی ناواقفیت ہے، اس واقعہ کو حضرت انس ؓ کے علاوہ حضرت عائشہ ؓ نے[1] اور حضرت ابن عمر ؓ نے[2] اور حضرت سلمۃ بن الاکوع ؓ نے[3] بھی روایت کیا ہے۔

امر خامس پر نظر

حدیث مذکور پر ''حق گو'' صاحب کا پانچواں اعتراض بھی قلت تدبر کا نتیجہ ہے، پیشاب بے شک ناپاک ہے، اور اس کا استعمال بھی بے شبہہ حرام ہے لیکن آپ نے غور نہیں کیا، کہ عرینین کو استسقاء کی بیماری ہوگئی تھی، اطباء کی قلت، دواخانوں کے فقدان اور بے زری کی وجہ سے کوئی دوسرا علاج ممکن نہ تھا، اور عرب لوگ اس مرض کا علاج اونٹ کا پیشاب پلا کر کیا کرتے تھے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کی جان بچانے کے لئے اونٹوں کا پیشاب پینے کی اجازت دی، جیسا کہ قرآن کریم نے مردار اور دم مسفوح وغیرہ کو حرام قطعی بتاتے ہوئے اس شخص کے لئے بقدر سد رمق

---

[1] نسائی: ۲/۱۶۷
[2] نسائی: ۲/۱۶۷، ابوداؤد: ۲/۱۴۰
[3] زرقانی: ۲/۱۷۶

استعمال کرنے کی اجازت دی، جس کی بھوک پیاس سے جان جا رہی ہو "فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیه" کیوں "حق گو" صاحب! کیا یہاں بھی آپ یہ سوال کر بیٹھیں گے کہ کیا خدا مردار کھانے کی اجازت دیتا ہے؟ تو پھر اسی عرینین کے واقعہ کو بھی قیاس کر لیجئے۔

"حق گو" صاحب نے ساتواں عنوان یوں قائم کیا ہے:

آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ۹ سال کی عمر میں نکاح کرتے ہیں

اور اس کے ماتحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح اور رخصتی کا واقعہ نقل کر کے لکھتے ہیں:

> "نکاح کے لئے بلوغ کی شرط نہ صرف قرآن کے صاف صریح الفاظ "حتی اذا بلغوا النکاح" سے ثابت بلکہ کوئی متمدن قانون نہیں ہے، جو نکاح کے لئے بلوغ کو ضروری نہ کہتا ہو، نکاح سے میری مراد خلوت صحیحہ اور جماع ہے، اسلام میں نکاح ہی نہیں ہوتا ہے جب تک کہ عورت بالغ نہ ہو، کیونکہ ایجاب وقبول کے لئے شرط بلوغ ہے، عرب میں ہر زمانہ میں بلوغ کی عمر زیادہ رہی ہے۔"

"حق گو" صاحب کا یہ فرمانا تو ایک حد تک بجا ہے کہ خلوت و جماع کے لئے بلوغ شرط ہے، لیکن اس سے بہتر عنوان یہ تھا کہ، اہلیت وصلاحیت شرط ہے۔

جواز نکاح کے لئے بلوغ شرط نہیں

باقی انکا یہ دعویٰ کہ نکاح کے لئے بلوغ کی شرط قرآن کے الفاظ "حتی اذا بلغوا النکاح" سے ثابت ہے، بالکل غلط ہے "حق گو" صاحب کو معلوم ہونا

چاہئے، کہ جس آیت کے یہ الفاظ ہیں، اس میں نکاح اور اس کے شرائط کا بیان نہیں ہے، بلکہ مال یتیم کی نگرانی وحفاظت کا حکم اس میں مذکور ہے، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ ”جب یتیم بچے نکاح کو پہنچ جائیں، اور تم کو محسوس ہو کہ اب وہ اپنے مال کی حفاظت کریں گے، تو ان کو ان کا مال دے دو۔“ قرآن کے الفاظ یہ ہیں ”حتّٰی اذا بَلغُوا النکاح فَاِن آنستم مِنھم رُشدافا دفعُوا الیھِمْ اموالھم“ بتایئے کہ ان میں کس لفظ سے ثابت ہوتا ہے، کہ نکاح کے لئے بلوغ شرط ہے اور اس کا یہاں کیا محل ہے؟ اگر کہئے کہ آیت میں اگرچہ نکاح کا حکم مذکور نہیں، تاہم ”اِذا بَلغُوا النِکاح“ سے یہ مستفاد ہوتا ہے، کہ انسان ابتدائے پیدائش سے ہی جماع کے قابل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے کوئی خاص وقت ہوتا ہے اس لئے فرمایا کہ ”جب یتیم بچے نکاح کو یعنی اس کے وقت کو پہنچ جائیں“ تو میں کہوں گا کہ بے شک یہ ضرور مستفاد ہوتا ہے لیکن اس خاص وقت کا بیان قرآن میں نہیں ہے، یعنی اس وقت کی قرآن نے تعیین نہیں کی کہ وہ حیض کی ابتداء یا آغاز احتلام کا وقت ہے، یا عمر انسانی کا کوئی معین سال، مثلاً پندرہواں یا اٹھارہواں سال، یا وہ وقت جب کہ مرد وعورت میں جماع کی قوت پیدا ہو جائے، چاہے حیض یا احتلام شروع ہو یا نہ ہو، اور عمر کے پندرہ یا اٹھارہ سال پورے ہوئے ہوں یا نہ ہوں، پس جب قرآن میں یہ تعیین نہیں ہے تو آپ کا مدعا کسی طرح ثابت نہیں ہوسکتا، اور نہ آیت آپ کے مفید مطلب ہو سکتی ہے۔

یہ آیت ”حق گو“ کے مدعا کے خلاف ہے

بلکہ اگر آپ غور کریں گے تو یہ آیت آپ کے مطلب کے لئے بہت مضر ثابت ہوگی، وہ اس طرح کہ اگر جماع کے لئے اللہ کے علم میں کوئی خاص سال عمر کا متعین ہوتا، اور اس سے کم عمر میں وطی حرام ہوتی تو صاف صاف اس سال معین کا نام لینے میں کیا قباحت تھی؟ خصوصاً جب کہ قرآن کے سوا (بزعم منکر حدیث) اور کوئی ذریعہ

بیان بھی موجود نہ تھا، پس دو حال سے خالی نہیں، یا تو اس وقت خاص کی تعیین اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے حوالہ کی ہوگی، اور لوگوں کو مامور کیا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل سے اس خاص وقت کی تعیین معلوم کرو، یا پھر اس کو زوجین اور ان کے اولیاء کی رائے پر چھوڑا ہوگا کہ زوجین خود یا ان کے سر پرست عرف و عادت اور جسمانی حالت وغیرہ کے ذریعہ سمجھیں کہ ان میں جماع کی قوت وصلاحیت پیدا ہوگئی ہے یا نہیں، بہرحال کسی شق میں جماع کے لئے کسی خاص عمر کی تحدید قرآن سے ثابت نہ ہوگی، نہ بلوغ بمعنی حیض واحتلام یا عمر خاص کا شرط نکاح بمعنی جماع ہونا اس سے ثابت ہوگا، اور اگر ''حق گو'' صاحب پہلی شق اختیار کریں گے، تو ان کو حدیث کا حجت ہونا بھی علی الرغم ماننا پڑے گا، اسی طرح اپنے اس فقرہ میں بھی کہ:

''اسلام میں نکاح ہی نہیں ہوتا جب تک عورت بالغ نہ ہو''

انہوں نے خلط مبحث کر دیا، اس لئے کہ اگر یہاں بھی نکاح سے مراد خلوت ہے تو یہ وہی پہلی بات ہوئی، لہٰذا تکرار بے فائدہ ہے، نیز اس کی یہ علت بیان کرنا کہ

''ایجاب وقبول کے لئے بلوغ شرط ہے۔''

بالکل بے جوڑ بات ہے، ہر آدمی جانتا ہے کہ ایجاب وقبول کی ضرورت نکاح بمعنی عقد میں پیش آتی ہے، بلکہ نکاح بمعنی عقد اسی ایجاب وقبول کا دوسرا نام ہے، اور اگر یہاں نکاح سے مراد عقد ہے، تو گزارش ہے کہ آپ کے اس فقرہ میں کہ ایجاب وقبول میں بلوغ شرط ہے، کس کا ایجاب وقبول مراد ہے، اگر کہئے کہ میاں بیوی کا تو جناب والا کو معلوم ہونا چاہئے کہ نابالغوں کے نکاح میں ایجاب وقبول ان کے ولی و سر پرست کرتے ہیں، اور انہی کے ایجاب وقبول کا جس کو وہ نابالغ کی جانب سے بحیثیت سر پرست کرتے ہیں، اعتبار کیا جاتا ہے، اور اگر کہئے کہ اولیاء اور سر پرستوں ہی کا ایجاب وقبول مراد ہے، تو صحیح ہے، لیکن ولی تو بالغ ہی ہوتا ہے، اور اسی کے ایجاب وقبول سے نابالغوں کا نکاح ہوتا ہے، پس میاں بیوی کی نابالغی کچھ

مضر نہ ہوگی، پھر آپ نے یہ کیسے لکھ دیا، کہ اسلام میں نکاح ہی نہیں ہوتا، جب تک کہ عورت[1] بالغ نہ ہو۔"

ایجاب وقبول سرپرستوں کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے

اور اگر آپ کا خیال ہے کہ ولی کوئی چیز نہیں اور جب تک کہ میاں بیوی ایجاب و قبول نہ کریں، نکاح نہیں ہوسکتا، اور نابالغ ایجاب وقبول کے اہل نہیں ہیں، اس لئے نابالغوں کا نکاح ممکن نہیں ہے، تو یہ محض بے بنیاد و بے دلیل خیال ہے مسلمانوں میں کوئی فرقہ آپ کا ہم خیال نہیں نہ اس خیال کی تائید کسی حدیث سے ہوتی ہے، نہ آیت سے، بلکہ قرآن کی متعدد آیات سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے، ایک مقام پر ارشاد ہے "لَا تنکحُوا المشرکیْنِ حَتّٰی یُؤمنُوا" اے اولیاء! نہ نکاح کرو (اپنی بہن بیٹیوں کا) مشرکین سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں" (یعنی جب وہ ایمان لائیں، تو اپنی لڑکیوں وغیرہ کو ان سے بیاہ سکتے ہو) دیکھئے یہاں ولی سرپرست مردوں کو خطاب کر کے یہ حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ نکاح میں ان کو بھی دخل ہے، دوسری جگہ فرمایا "وانکحوا الایامی منکم" یعنی اے سرپرستو! اپنے خاندان کی ان عورتوں کا جن کے شوہر نہیں ہیں، کسی سے نکاح کردو۔" اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ نکاح کردینے کا اختیار سرپرستوں کو بھی حاصل ہے، اگر ان کو کچھ اختیار نہ ہوتا تو بے وجہ یہ حکم نہ دیا جاتا۔

اور حدیثوں میں بصراحت یہ حکم مذکور ہے کہ نابالغوں کا نکاح سرپرستوں کے

---

[1] سورۂ طلاق کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "وَالّٰئی لَمْ یَحِضْنَ" اس میں نابالغ لڑکیوں کی عدت بیان فرمائی گئی ہے، ظاہر ہے کہ اگر نابالغوں کا نکاح ناجائز ہوتا تو ان کے لئے عدت کی بھی ضرورت نہ تھی، نابالغہ کی عدت کا ہونا اس امر کی روشن اور کھلی ہوئی دلیل ہے، کہ یہ نکاح جائز ہے، نہ معلوم منکرین حدیث کی عقلیں اس درجہ مسخ کیوں ہوگئی ہیں کہ قرآن شریف کے ایسے آسان اور واضح مسائل کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ (قاسمی عفا اللہ عنہ)

ایجاب وقبول سے ہو جاتا ہے۔

”حق گو“ کی دورنگی

مجھے ”حق گو“ صاحب کی اس دورنگی پر تعجب ہے، کہ وہ نکاح کے لئے گواہوں کا ہونا تو ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ گواہوں کی ضرورت بھی صرف حدیثوں سے ثابت ہے، قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن نابالغ کے نکاح کی صحت کو ولی کے ایجاب وقبول سے تسلیم نہیں کرتے، باوجودیکہ حدیثوں کے علاوہ قرآن سے بھی ثابت ہے۔

”حق گو“ صاحب کا یہ قول بھی محتاج دلیل ہے، کہ عرب میں بلوغ کی عمر ہمیشہ ہندوستان سے زیادہ رہی ہے ”حق گو“ صاحب نے کچھ نہ بتایا کہ ان کو اس کا کس طرح علم ہوا، اور اگر کہیں سے یہ ثابت بھی ہو جائے، تو آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ کبھی اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

خلاف عادت واقعات

کیا دنیا میں عادت کے خلاف واقعات نہیں ہوتے ہیں یہ موقع نہیں ورنہ میں آپ کے معصوم راویوں (یعنی عقلائے فرنگ) کی زبانی ایسے صدہا واقعات سناتا، اخبارات میں روزانہ ایسے واقعات کی اطلاعات شائع ہوتی رہتی ہیں پس اگر فرض بھی کر لیجئے، کہ عرب میں عموماً لڑکیاں ۹ برس میں بالغ نہ ہوتی ہوں، تو اس میں کیا استبعاد ہے، کہ کوئی لڑکی خلاف عادت ۹ ہی برس میں بالغ ہو جائے ”حق گو“ صاحب کو تو یہی مستبعد معلوم ہوتا ہے لیکن نہایت مستند طریق سے ثابت ہے کہ عرب میں بعض لڑکیاں نو[1] برس کی عمر میں ماں اور اٹھارہ برس کی عمر میں نانی ہوگئی ہوں۔[2]

---

[1] اخبار ”مدینہ“ بجنور مجریہ یکم جولائی ۳۴ میں یہ خبر کامل تحقیقات کے بعد شائع ہوئی ہے کہ وکٹوریہ ہسپتال دہلی میں ایک سات سال سے کم عمر کی لڑکی نے ایک بچہ جنا ہے ”جلت قدرته“. (اعظمی)

[2] دار قطنی: ص ٤٢٥

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی نسبت قابل وثوق ذرائع سے معلوم ہے، کہ ان کے جسمانی قوی بہت بہتر تھے، اور ان میں قوت نمو بہت زیادہ تھی، اس لئے بہت تھوڑی عمر میں وہ قوت ان میں پیدا ہوگئی تھی، جو شوہر کے پاس جانے کے واسطے ایک عورت کے لئے ضروری ہے، داؤدی نے لکھا ہے ”وکانت عائشہ شبت شبابا حسناً“ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بہت عمدگی کے ساتھ سن شباب تک ترقی کی تھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طبعی حالات تو ایسے تھے ہی، ان کی والدہ نے ان کے لئے ایسی غذا کا بھی خاص اہتمام کیا تھا کہ وہ جلد از جلد ترقی کر جائیں، چنانچہ ابوداؤد (جلد۲ صفحہ۹۸) اور ابن ماجہ (صفحہ۲۴۶) میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان مذکور ہے، کہ میری والدہ نے میری جسمانی ترقی کے لئے بہتیری تدبیریں کیں، آخر ایک تدبیر سے خاطر خواہ فائدہ ہوا، اور میرے جسمانی حالات میں بہترین انقلاب پیدا ہو گیا، اس کے ساتھ اس نکتہ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے، کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خود ان کی والدہ نے بدون اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے رخصتی کا تقاضا کیا گیا ہو، خدمت نبوی میں بھیجا تھا، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ پر کیا موقوف ہے کوئی ماں اپنی بیٹی کی دشمن نہیں ہوتی، بلکہ لڑکی سب سے زیادہ اپنی ماں ہی کی عزیز و محبوب ہوتی ہے، اس لئے ناممکن ہے کہ انہوں نے صلاحیت واہلیت سے پہلے ان کو رخصت کیا ہو۔

اس حدیث کے غلط ہونے کی پہلی وجہ

اس کے بعد ”حق گو“ صاحب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی بعمر نہ سالگی کی تردید چار وجہوں سے کرتے ہیں:

> ”اول حضرت اسماء حضرت عائشہ کی بہن ان سے دس سال بڑی تھیں، اور اسماء کی عمر انتقال کے وقت یعنی ۷۶ھ (”حق گو“ صاحب نے سنہ غلط نقل کیا ہے، ۷۳ھ ہونا چاہئے) میں سو سال سے متجاوز تھی (صحیح یہ

ہے، کہ سو سال تھی) حضرت اسماء کے بڑے صاحبزادے عبدالرحمٰن بن زبیر آنحضرت ﷺ کے سامنے اس قدر جوان تھے کہ انہوں نے اس عورت سے نکاح کیا، جس نے اپنے شوہر کی شکایت کرتے ہوئے ان کو کپڑے کے کھونٹ سے مشابہت دی تھی، بہر حال ہجرت کے سال اسماء کی عمر ۲۵، ۲۶ سال سے کم نہ تھی، اور اس لئے حضرت عائشہ کا سن منگنی کے وقت ۱۶ سال اور نکاح کے وقت ۱۹ سال تھا۔“

”حق گو“ کی ”اعلیٰ قابلیت“ کے چند نمونے

”حق گو“ صاحب نے اس وجہ میں اپنی قابلیت کی خوب خوب نمایش کی ہے، اکمال سے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا سن وفات ۶۷ھ نقل کیا، حالانکہ اس میں ۳۷ھ مذکور ہے، اسی کتاب سے ان کی عمر سو سال سے متجاوز بتائی، حالانکہ اس میں سو ہی کا ذکر ہے، ہجرت کے وقت حضرت اسماء رضی اللہ عنہ کی عمر ۲۵، ۲۶ سال بتائی، حالانکہ خود ان کی تحریر کے مطابق ۲۴ سال سے زیادہ نہیں ہوتی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر منگنی کے وقت ۱۶ بتائی، حالانکہ ان کی تحریر سے ہجرت کے وقت بھی حضرت عاشہ رضی اللہ عنہا کی یہ عمر ثابت نہیں ہوتی بلکہ ۱۶ کے بجائے ۱۴ سال ثابت ہوتی ہے، اور چونکہ تاریخوں سے ثابت ہے، کہ ہجرت سے تین سال پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی منگنی یعنی عقد ہو چکا تھا،[1] پس ”حق گو“ صاحب کے مقدمات کی بنا پر منگنی کے قت ۱۱، اور رخصتی کے وقت ۱۴ سال کی عمر ثابت ہوگی، اور سب سے بڑھ کر لطیفہ یہ ہے کہ ”حق گو“ صاحب نے عبدالرحمٰن ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کو جن کی بی بی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں شکایت کی تھی، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا بیٹا لکھ دیا، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، یہ عبدالرحمٰن نہ اسماء رضی اللہ عنہا کے بیٹے ہیں، نہ زبیر بن العوام شوہر اسماء رضی اللہ عنہا کے بلکہ وہ زبیر (بروزن

---

[1] زرقانی و فتح وغیرہ

کریم) ابن باطیا کے بیٹے ہیں۔[1]

''حق گو'' صاحب کی قابلیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چند سطروں میں انہوں نے پانچ فاش غلطیاں کی ہیں۔

اکمال کی عبارت پر بحث

اس کے بعد اب اصل بحث پر گفتگو ہے، کہ بے شبہ اکمال کی عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی چودہ سال کی عمر میں ہوئی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ صاحب اکمال نے اس عبارت میں کہیں ضرور غلطی کی ہے، ورنہ لازم آئے گا، کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اپنے شوہر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ۹ سال بڑی ہوں، اس لئے کہ اکمال کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی عمر ہجرت کے سال ۲۷ برس کی تھی، اور مستدرک حاکم وغیرہ میں ہے کہ زبیر کی عمر اس وقت ۱۸ سال کی تھی، نیز یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پہلو نٹے ہیں، اور ان کی پیدائش ہجرت کے پہلے ہی سال میں ہوئی، پس اگر ہجرت کے سال حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی عمر ستائیس سال ہو تو نہایت مستبعد معلوم ہوتا ہے، کہ عبداللہ پہلو نٹے ہوں، اور ان سے پہلے حضرت اسماء رضی اللہ عنہ کے ۲۷ سال تک کوئی اولاد نہ ہوئی ہو، اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود ان کے دو کلاموں میں سخت تعارض واقع ہو جائے گا، اس لئے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے حال میں جو کچھ انہوں نے لکھا اس سے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر ہجرت کے سال ۱۷ برس ثابت ہوتی ہے، لیکن خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حال میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہجرت کے ڈیڑھ سال بعد یا سات ماہ بعد ان کی عمر نو سال کی تھی، پھر دوسرا تعارض یہ ہے کہ ان کے پہلے قول کی بنا پر وفات نبوی ﷺ کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۲۷ سال

---

[1] فتح الباری: ۵/۳۷۵

ہوگی، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حال میں خود انہیں نے تصریح کی ہے، کہ ''اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی'' پس جب ان کے کلام میں تعارض واقع ہوگیا تو ان کا کلام قابل استدلال نہ رہا۔

دوسری وجہ

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب کی دوسری وجہ ملاحظہ ہو:

> ''عبدالرحمٰن بن ابی بکر فتوحات شام میں قائداعظم (سپہ سالار) تھے، اور وہ حضرت عائشہ سے سن میں اس قدر چھوٹے تھے، کہ حضرت عائشہ ان کو وضو کا طریقہ سکھایا کرتی تھیں، پس اگر حضرت عائشہ کا سن ہجرت میں نو سال رکھا جائے، تو اس حساب سے عبدالرحمٰن کی قیادت فتوحات شام میں اس قدر کمسنی میں پائی جاتی ہے، کہ محال ہے فتوحات شام ۱۶ھ کا واقعہ ہے۔''

''حق گو'' کے تاریخی معلومات کی رسوائی

''حق گو'' صاحب نے اس وجہ کو ذکر کر کے اپنی تاریخ دانی کو حد درجہ رسوا کر دیا، اولاً تو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا، اپنے تمام بھائی بہنوں سے بڑے تھے، اور کتابوں کا ذکر چھوڑیئے، خود اسی اکمال میں جس کا حوالہ ''حق گو'' صاحب نے پہلی وجہ میں دیا ہے مذکور ہے، ''وکان اسَنَّ وُلد ابی بکر'' (یعنی) یہ اولاد ابوبکر میں سب سے بڑے تھے، حیرت ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے دوسری وجہ لکھتے وقت اکمال کی طرف مراجعت کیوں نہیں کی، ثانیاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طریقۂ وضو سکھانے کا جو ذکر انہوں نے کیا ہے، اس کی اصلیت یہ ہے، کہ ایک دن حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور پانی مانگ کر وضو کرنے لگے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اعضاء کو اچھی طرح

اور پورا دھویئے، اس واقعہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے. کہ شاید حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے جلدی میں وضو کیا، اور کوئی جگہ خشک رہ گئی، اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو بالکل اسی طرح جس طرح کوئی چھوٹا آدمی اپنے بڑے کو اس کی بھول و چوک پر متنبہ کر دیتا ہے، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو ٹوک دیا، حدیث و تاریخ میں اس قسم کے صدہا واقعات ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے سے بہت معمر صحابیوں کو بہت بہتیری باتیں بتائیں، تو کیا وہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے کمسن قرار پائیں گے، ثالثاً اگر بالفرض حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چھوٹے بھی ہوں، تو فتوحات شام میں ان کی قیادت محال تو درکنار مستبعد بھی نہیں ہے، ''حق گو'' صاحب کے نزدیک اگر وضو کا طریقہ سکھانے کی وجہ سے حضرت عبدالرحمٰن کا چھوٹا ہونا ضروری ہو تو اس کے لئے نو برس چھوٹا ہونا ان کے نزدیک بھی بہت کافی ہوگا لیکن اس تقدیر پر بھی فتوحات شام کے ایام میں ان کی عمر ۱۶ سال ہوگی، جو قابلیت قیادت کے لئے بہت کافی ہے، ''حق گو'' صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ قیادت جنگ کے لئے پیرفانی ہونا شرط نہیں ہے، قابل ہونا چاہئے، خواہ وہ نوجوان ہی ہو، اور اس کے لئے ان کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت کا واقعہ پڑھنا چاہئے جن کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قائد مقرر کیا تھا، باوجودیکہ اس وقت ان کی عمر ۱۸ یا ۲۰ سال تھی۔ [1]

تیسری وجہ

''حق گو'' صاحب نے یہ ذکر کی ہے:

> ''یہ ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جنگ جمل میں شرکت کی، اور قرآن سے ظاہر ہے کہ امہات المؤمنین کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں، تاوقتیکہ وہ مستثنیات میں داخل نہ ہو جائیں، یعنی بوڑھی نہ ہو جائیں، پس اگر ان کی مفروضہ عمر (یعنی نو سال رخصتی کے وقت) تسلیم کر لی جائے، تو

---

[1] اصابہ

جنگ جمل میں ان کا بڑھاپا نہ آیا، (لہٰذا قرآن کی مخالفت لازم آئے گی) اور یہ حضرت عائشہ سے نہایت بعید ہے۔"

اس کا جواب

"حق گو" صاحب کی یہ وجہ بھی ان کے قلت تدبر کی شرمندہ احسان ہے، قرآن پاک میں ازواج مطہرات کو گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت مطلق نہیں ہے، بلکہ یہ ممانعت اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے، کہ زمانۂ جاہلیت کے انداز پر نکلنا ہو، یعنی زیب وزینت کے ساتھ رنگین لباسوں میں ملبوس ہوکر بے پردہ نکلنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم کے صریح الفاظ ہیں "وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولی" (یعنی اپنے گھروں میں قرار پکڑو، اور جاہلیت قدیم کے انداز پر بناؤ سنگار کر کے نہ نکلو) لہٰذا جب بے بناؤ سنگار کے اور باپردہ نکلنے کو قرآن نے منع کیا ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چاہے جس سن میں بھی جنگ جمل میں شریک ہوئی ہوں، اس آیت کی مخالفت لازم نہیں آسکتی، اور نہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکلنا قابل اعتراض ہوسکتا ہے، تاریخوں سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہودج میں سوار ہوکر پورے پردے کے ساتھ گئی تھیں۔ "حق گو" صاحب نے اس پر بھی غور نہ کیا کہ اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ خود ازواج مطہرات کو لے کر حج وعمرہ کے لئے گھر سے نکلے، پس اگر یہ حکم مطلق ہوتا، تو کیونکر ممکن تھا کہ آنحضرت ﷺ ان کو لے کر جاتے۔

پھر یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ قرآن میں اس آیت کے بعد ایک اور آیت بھی ہے، جس میں ازواج مطہرات کو گھونگھٹ نکالنے کا حکم دیا گیا ہے، پس اگر ان کے لئے باہر نکلنا قطعاً ممنوع ہے، تو گھونگھٹ نکالنے کا حکم دینا بے ضرورت ہوگا، اس لئے کہ اس کی ضرورت تو باہر ہی نکلنے میں پیش آسکتی ہے۔

اچھا ان سب باتوں کو جانے دیجئے اور فرض کر لیجئے کہ ''حق گو'' صاحب کے تمام مقدمات صحیح ہیں، جب بھی تو ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جنگ جمل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بڑھاپا نہ آیا تھا، معلوم ہوتا ہے ''حق گو'' صاحب کو واقفیت نہیں ہے کہ جنگ جمل ۳۶ھ کا واقعہ ہے، اور رخصتی کے وقت اگر ان کی عمر نو سال مانی جائے تو جنگ جمل میں ان کی عمر ۴۵ سال ہوتی ہے، اور اس عمر کو خود ''حق گو'' صاحب بڑھاپے کی عمر مانتے ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ وہ اسی رسالہ کے (صفحہ ۸) میں لکھ چکے ہیں، کہ:

> ''(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی ساری جوانی ایک بوڑھی بیوہ کے ساتھ گزار چکے تھے۔''

ظاہر ہے کہ اس ''بوڑھی بیوہ'' سے مراد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں، اور تاریخوں سے ثابت ہے کہ ان کی عمر نکاح کے وقت ۴۵ سال سے کسی طرح زیادہ نہ تھی، بلکہ اکثر اصحاب سیرۃ کے قول پر ۴۰ سال سے زیادہ نہ تھی۔

پس حیرت ہے کہ جب بقول ''حق گو'' صاحب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بڑھاپا ۴۰ سال کی عمر میں آگیا تھا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بڑھاپا ۴۵ سال کی عمر میں کیسے نہیں آیا؟

چوتھی وجہ

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب نے چوتھی وجہ یہ ذکر کی ہے کہ:

> ''عمروں کے متعلق روایتیں نہایت متضاد ہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حضرت فاطمہ کا کس سنہ میں انتقال ہوا، اور ان کی کیا عمر تھی، حضرت عائشہ کی (رحلت) کے متعلق روایات مختلف ہیں۔''

اختلاف روایات سے کوئی فن بے اعتبار نہیں ہوسکتا

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عمروں کے متعلق روایات مختلف ہوتی ہیں، لیکن تنقید

روایات کے اصول سے محقق اور راجح بات کا پتہ چل جاتا ہے، لہٰذا اس اختلاف کی بنا پر فن بے اعتبار نہیں ہوسکتا، علاوہ بریں یہاں اس تضاد کا ذکر بالکل بے محل ہے، اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی بعمر نو سال کے خلاف کوئی روایت موجود ہی نہیں، صحیحین کے علاوہ اور جہاں جہاں ان کی رخصتی کا ذکر ہے، سب جگہ ۹ ہی سال میں رخصتی کو لکھا ہے کیا ''حق گو'' صاحب اس کے خلاف کوئی روایت پیش کر سکتے ہیں؟

''حق گو'' صاحب کے ملحدانہ بیانات

مذکورہ بالا سات عنوانوں کے بعد ''حق گو'' صاحب نے چند اور دلآزار عنوان قائم کئے ہیں، اور ان کے ماتحت نہایت آزادی سے اپنے ملحدانہ خیالات کو ظاہر کیا ہے، اور محدثین کرام وفقہائے اسلام رحمۃ اللہ علیہم پر خوب گندگیاں اچھالی ہیں، یہ عنوانات بجائے خود ان کی بے دینی و الحاد کے مستقل دلائل ہیں، چند عنوان ملاحظہ ہوں، ''یہودیت وحدیث''، ''مسیحیت وحدیث'' اور ''حدیث و مجوسیت'' ان عنوانات کے ماتحت ''حق گو'' صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ، حدیث کا تمام تر سرمایہ انہی غیر مسلم قوموں سے ہاتھ آیا ہے، اور محدثین نے انہی قوموں کی باتوں کو سن کر اور ہر بات کے لئے ایک فرضی اسناد بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اپنے تخیلات فاسدہ اور توہمات باطلہ کے سوا اس بیان کی کوئی دلیل انہوں نے ذکر نہیں کی، پس اس حالت میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی باتیں کہاں تک قابل التفات وتوجہ ہوسکتی ہیں، کیا ''حق گو'' صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی داں طبقہ جس میں وہ اپنے ملحدانہ خیالات کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں، ان کی ہر بے دلیل بات اور بے ثبوت دعویٰ کو تسلیم کر لے گا، کیا یہ طبقہ تاریخی حقائق کے خلاف آپ کے بے بنیاد مزعومات کو بے تامل مان لے گا، ہم کو حیرت ہے کہ ''حق گو'' صاحب

نے اس طبقہ کی نسبت یہ خیال کیسے قائم کرلیا، اور مستند تاریخی بیانات کے خلاف ان کو یہ لکھنے کی کیونکہ جرأت ہوئی کہ۔

> ”خلفائے راشدین کے زمانہ میں اور خصوصاً حضرت عمر کے سامنے کسی کی مجال نہ پڑتی تھی کہ وہ کوئی حدیث بیان کرے اور یقینی بات ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے سے قبل تک لوگ حدیثوں کو نہ جانتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جو سنگین واقعات اس سے پہلے پیش آئے مثلاً شہادت امام حسین وعبداللہ بن زبیر وفتنہ وبغاوت بزمانہ عثمان اور جنگ جمل وغیرہ ان میں سے ایک کا بھی اشارہ قیامت کی پیشین گوئیوں کے سلسلہ میں نہیں ہے۔“

صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت حدیث اور ان کا حدیث کے سامنے سر تسلیم خم کرنا

”حق گو“ صاحب نے ان سطروں میں جن تاریخی حقائق کا انکار کیا ہے، ان کے انکار کی جرأت کوئی حیا دار انسان نہیں کرسکتا، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے خود حدیثیں بیان کی ہیں، اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بہت سے مقدمات میں حدیثیں دریافت کرکے ان کے مطابق فیصلے کئے ہیں، تاریخ الخلفاء تاریخ کی چھوٹی سی کتاب ہے، اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیان کی ہوئی ایک سو چار حدیثوں کا ذکر موجود ہے، اور تاریخوں میں یہ بھی بصراحت مذکور ہے کہ جب صحابہ میں اختلاف ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں دفن کیا جائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث سنا کر اس اختلاف کو رفع کیا، پھر خلافت کے مسئلہ میں انصار ومہاجرین کا اختلاف ہوا تو، اس موقع پر بھی انصار کے مناقب اور قریش کے استحقاق خلافت کی حدیثیں سنا کر دونوں گروہوں کو متفق کر دیا، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کے سامنے

روایت حدیث کی ہے۔

روایت حدیث میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی احتیاط

ہاں اتنا ضرور ہے کہ حضرت شیخین خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سخت تاکید تھی کہ حدیثوں کے بیان کرنے میں بے احتیاطی نہ کی جائے، خوب غور و فکر کر کے صحیح بات بیان کی جائے ایسا نہ ہو کہ زیادہ گوئی میں کوئی غلط بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو جائے، یہ ساری باتیں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی تاریخی تصنیفات میں تفصیل سے مذکور ہیں، اور یہی حال حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کا بھی تھا، لہٰذا یہ کہنا کہ۔

> ''عمر بن عبدالعزیز سے پہلے لوگ حدیثوں کو نہ جانتے تھے۔''

ایسا جھوٹ ہے، جس کی کوئی تاویل ممکن نہیں ہے، ''حق گو'' صاحب کو اگر عربی کتابوں پر دسترس حاصل نہ تھا، تو کم از کم سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدمہ ہی ملاحظہ کر لیتے، ہندوستان کا یہ وسیع النظر مورخ کتنی صراحت سے لکھتا ہے کہ۔

> ''صحابہ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، اور بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے، لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا۔''

اس کے بعد بنو امیہ کے عہد میں تصنیف و تالیف کے شروع ہونے کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ:

> ''حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ آیا، تو انہوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی۔''

ان اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے کہ۔

❶ صحابہ و خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں بکثرت احادیث کی روایت ہوئی۔

❷ کچھ حدیثیں قید کتابت میں بھی آئی ہیں لیکن زیادہ تر زبانی روایت ہوتی تھی۔

③ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے پہلے ہی تصنیف کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

④ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں تصنیف کو ترقی ہوئی۔

لہٰذا ''حق گو'' صاحب کا یہ کہنا کہ:

> ''حدیث کی سب سے پہلی کتاب جو مدون ہوئی وہ ابن جریج المتوفی ۱۵۰ کی ہے۔''

بالکل غلط ہے، اس لئے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ اس سے پہلے بھی حدیث کی کتابیں لکھوا چکے تھے، اور ان کا زمانہ خلافت ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک ہے، بلکہ ان سے پہلے بھی تصنیفیں ہو چکی تھیں۔

مغازی پر حملہ

بہر حال ''حق گو'' صاحب کے مذکورہ بالا بیان کے غلط ہونے میں تو کوئی شبہہ نہیں لیکن اس کو چھوڑیئے اور ان کی یہ بات یاد رکھئے کہ۔

> ''عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے کوئی حدیثوں کو جانتا نہ تھا۔''

اور اس کے بعد ان کا دوسرا بیان پڑھئے لکھتے ہیں:

> ''ایک ہی صدی کے بعد ...... وضع حدیث کی گرم بازاری ہوئی، ...... مسلمانوں کا پہلا دور فتوحات ملکی اور سیاست کا تھا، اس دور میں اگر انہوں نے رسول اللہ کی مبارک سیرت کے کسی شعبہ سے اعتناء کیا ہے تو وہ آپ کی سنیت و عبادت نہیں ہے، بلکہ مغازیات ہے...... لیکن جس شخص نے اس پر سب سے پہلے نظر ڈالی ہے، وہ اپنی روایتوں میں حد درجہ ناقابل اعتبار ہے، اور یقیناً سلاطین وقت کی عام خونریزیاں اور یہودیوں کی وہ خرافات واتہام، جو وہ داؤد اور سلیمان اور یوشع پر لگاتے

تھے ان کی صدائے بازگشت ان مغازیات میں ہے۔''

''حق گو'' صاحب کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھئے اور بتایئے کہ بجز اس شخص کے جس کے دماغ میں خلل ہو کسی اور کے قلم سے ایسی باتیں نکل سکتی ہیں، میں ''حق گو'' صاحب سے پوچھتا ہوں کہ وفات نبوی کے بعد مسلمانوں کا پہلا دور تو خلافت راشدہ کا دور ہے، تو کیا اسی زمانہ میں مغازی رسول اللہ ﷺ کی تصنیف شروع ہوئی ہے، اور کیا اس دور میں بھی لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی سنت و عبادت کے ساتھ اعتناء نہیں تھا اور کیا خلافت راشدہ کے دور میں بھی عام خونریزی اور جبر و استبداد جاری تھا۔

مغازی کی طرف سب سے پہلے کس نے توجہ کی؟

حالانکہ فن تاریخ کا ابجد خواں بھی جانتا ہے کہ مغازی کی طرف حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں توجہ ہوئی، اور اسی زمانہ میں امام زہری المتوفی ۱۲۴ھ نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی، اور ان کے بعد ان کے شاگرد موسیٰ ابن عقبہ المتوفی ۱۴۱ھ اور ابن اسحاق المتوفی ۱۵۲ھ نے اس پر کتابیں لکھیں، پس اس بنا پر مغازی پر پہلے نظر ڈالنے والے زہری ہیں اور وہ بالاتفاق معتبر اور قابل استناد راوی ہیں، معلوم ہوتا ہے ''حق گو'' صاحب نے اپنی بے بضاعتی کے باعث یہ سمجھ رکھا ہے، کہ مغازی پر سب سے پہلے نظر ڈالنے والا واقدی ہے، اور وہ دور اول کا آدمی ہے، حالانکہ واقدی کو دور اول سے کچھ تعلق نہیں ہے، وہ تو زہری کے شاگردوں سے بھی متاخر ہے، واقدی کی وفات ۲۰۷ھ میں ہوئی۔[1]

''حق گو'' دشمنان اسلام کی صف میں

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

---

[1] کتابت حدیث کی مکمل تاریخ مقدمہ میں ملاحظہ کیجئے۔ ۱۲ منہ

> ’’اس کے بعد نظام ملکی کے لئے فقہ کی ضرورت ہوئی، اگرچہ اس کا مواد زیادہ تر رومیوں اور ایرانیوں کے متداولہ قوانین سے آیا ہے، لیکن اس کی سندراویوں کے سلسلہ سے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تک پہنچا دی گئی ہے۔‘‘

اس اقتباس کو پڑھ کر انصاف سے کہئے کہ ’’حق گو‘‘ صاحب اپنی اسلام دشمنی میں متعصب غیر مسلموں سے بھی دو قدم آگے ہیں یا نہیں؟ اللہ اللہ! ’’حق گو‘‘ صاحب مسلمان کہلا کر یہ اعتقاد رکھتے ہیں، کہ اسلام کا قانون نہایت نامکمل تھا، اس میں نظام ملکی کے قوانین نہیں تھے، اور قرآن و مبلغ قرآن نے اپنے ماننے والوں کو آئین حکومت اور نظام سلطنت نہ بتائے تھے، اور مسلمانوں کو اس کے لئے دوسروں کا محتاج اور دست نگر رکھا تھا، چنانچہ اسی بے آئینی کے ساتھ حضرت ابوبکر نے، حضرت عمر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے، حضرت عثمان نے، حضرت علی نے، اور حضرت معاویہ (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم) نے اور ان تمام خلفاء کے عمال نے، بلکہ ایک صدی کے بعد تک تمام خلفاء و امراء نے حکومت کی، ایک صدی کے بعد جب ایرانیوں اور رومیوں کے قوانین سے سرقہ کیا گیا، تو اس وقت مسلمانوں کے قوانین نظام حکومت مرتب ہوئے، بتایئے کہ ایک غیر مسلم اس سے زیادہ اسلام کی اور کیا توہین کر سکتا ہے؟

اسلامی قوانین کی اکملیت

افسوس ہے کہ ’’حق گو‘‘ صاحب کو شرم نہیں معلوم ہوتی کہ وہ مدعی اسلام ہو کر یہ بک رہے ہیں، اور ایک غیر مسلم ’’موسیو اوجین کلوفل‘‘ یہ لکھ رہا ہے، کہ۔

> ’’جب کوئی شخص قرآن کی آیتوں کو اس طرح مرتب کرے گا، تو وہ ہماری طرح یقیناً ذیل کے نتائج پر پہنچے گا (اول) یہ کہ محمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے ایک کامل مجموعہ تمدنی قوانین کا دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔‘‘

اور مشہور مسیحی مورخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے:

”بحر اوقیانوس سے لے کر دریائے گنگا کی انتہا تک الغرض مشرق سے لے کر مغرب تک قرآن مجید کو نہ صرف اصول دین کے لئے قانون اساسی تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ احکام تعزیرات، اصول تمدن واجتماع، قوانین معاشرت، انسانی زندگی کے مختلف نظامات اوران کی ترتیب بیان کرنے کے لئے ایک جامع کتاب ہے“ .... خلاصہ یہ کہ شریعت محمدیہ کی بنیاد ایسے مستحکم اور مضبوط اصول پر قائم کی گئی ہے، جس کی نظیر تمام دنیا کے ادیان و مذاہب میں نہیں پائی جاتی۔“

اور مسٹر ای، ڈی مارل لکھتا ہے کہ:

”اسلام افریقہ کے حبشیوں کے دلوں میں تہذیب و شائستگی کی روح پھونکنے، سول گورنمنٹ کا نظام اور حدود عدالت کے قائم کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوا ہے، قرآن ہی پیروان اسلام کا قانون اساسی ہے، اور وہی ان کا دستور العمل اور وہی ان کے حقوق کی دستاویز ہے، اکثر اوقات اس امر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اسلام نہ صرف ایک مذہب کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ وہ ایک نظام تمدن بھی ہے۔“

اور موسیو لیون راس لکھتا ہے کہ:

”اسلام ایک جامع الکمالات قانون ہے، جس کو انسانی، طبعی، اقتصادی، اور اخلاقی قانون کہنا بالکل بجا اور درست ہے، زمانۂ حال میں جتنے قوانین نوع انسان کی فلاح کے لئے وضع کئے گئے ہیں، وہ سب اس مقدس مذہب میں پہلے سے مفصل موجود ہیں۔“

اس قسم کے اقوال کہاں تک نقل کئے جائیں، خلاصہ یہ ہے کہ بابصیرت انسان چاہے وہ موافق ہو یا مخالف جانتا ہے کہ قانون اسلامی نہایت اکمل اور تمام قوانین سے اعلیٰ وارفع قانون ہے، اور اسلام کا پیرو انسان دنیا کے کسی قانون کا محتاج نہیں

ہے، قرآن زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح و بقاو ترقی کے قوانین پر مشتمل ہے، اور اس قانون کے مبلغ علیہ السلام نے اپنے قول وفعل سے پوری تشریح کر کے تمام قانون سے بے نیاز کر دیا ہے۔

شریعت اسلامیہ کی توہین

پس جب مخالفین کی تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ اسلام نظام ملکی یا ضروریات مذہبی کسی چیز میں بھی کسی دوسرے کا محتاج نہیں تو ''حق گو'' صاحب کا یہ لکھنا اسلام کی صریح توہین اور اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دینا ہے یا نہیں کہ:

> ''مذہبی مسائل میں بالکل یہود کے مذہبی مسائل کی تقلید ہونے لگی، اور جب مذہبی قانون بننا شروع ہوا، تو اس سے زیادہ آسان بات کیا ہو سکتی تھی، کہ ہر ایسے مسئلہ میں جس پر قرآن نے کچھ نہ کہا ہو، اور جس پر سنت متواترہ اور مسلمانوں کا عمل بھی نہیں ہے، اس کو یہود ونصاری سے لے کر اس پر فرضی سند لگا کر حدیث رسول کے نام سے پیش کر دیا جائے ...... نتیجہ یہ ہوا کہ دو صدی کے اندر یہود کی پوری شریعت اپنے نئے، چولے میں مسلمانوں پر ڈال دی گئی۔''[1]

شریعت اسلامیہ کی اس سے زیادہ توہین کیا ہو سکتی ہے، کہ ''حق گو'' صاحب کے زعم فاسد میں قرآن اور مبلغ علیہ السلام کی شریعت اتنی ناقص تھی کہ نہ اس میں قوانین ملکی تھے، نہ مسائل مذہبی، اس لئے قوانین حکومت کو تو مسلمانوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے چرایا اور مسائل مذہبی کا یہود ونصاری سے سرقہ کیا۔

اگر ''حق گو'' صاحب کہیں کہ میں ان چیزوں کی کلیۃً نفی نہیں کرتا، بلکہ یہ کہتا ہوں کہ کچھ باتیں مذہب وسیاست کی اسلام میں تھیں، اور جو نہیں تھیں، ان کو غیروں سے لیا گیا، ...... تو میں عرض کروں گا کہ پھر قرآن نے یہ دعویٰ کیوں کیا ''الیوم

---

[1] رسالہ منکرین حدیث: ص۱۱

اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِینکُمْ واتممتُ عَلَیْکُمْ نِعمتِی“ نیز مخالفین اسلام کے اقوال سے ابھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ اسلام سے زیادہ مکمل مذہب و قانون دوسرا کوئی مذہب وقانون نہیں ہے، پس اسلامیوں کو یہود ونصاری یا رومی وایرانی قوموں سے کچھ اخذ کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آسکتی ہے ”حق گو“ صاحب اب بھی ہوش میں آؤ، اور دیکھو کہ حدیثوں سے دشمنی کر کے تم اسلام کے بھی دشمن ہو گئے یا نہیں؟

ابن خلدون کی عبارت کے ترجمہ میں ”حق گو“ صاحب کی خیانت

اس مقام پر پہنچ کر ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ ”حق گو“ صاحب نے اس مطلب پر کہ:

”مسلمانوں نے یہودیوں سے باتیں سیکھ کر داخل مذہب کر لیں۔“

مقدمہ ابن خلدون کی ایک عبارت سے استدلال کیا ہے، لیکن افسوس ہے، کہ انہوں نے اس عبارت کے ترجمہ میں بدترین خیانت سے کام لیا ہے، سنئے قصہ یوں ہے کہ بعض مفسرین نے کتب تفاسیر میں کچھ اسرائیلی اقوال نقل کر دیئے ہیں ان تفسیروں کے ذکر کے سلسلہ میں ابن خلدون نے یہ لکھا ہے کہ:

> ”اسلام سے پہلے عرب کے پاس نہ کوئی کتاب آسمانی تھی، نہ علم تھا، اس لئے جب ان کو موجودات کے اسباب اور کائنات کی پیدائش کی ابتداء اور وجود کے اسرار کی نسبت کچھ معلوم کرنے کا شوق ہوتا تھا، تو یہود و نصاری سے پوچھ لیتے، پس جب اسلام لائے، تو جن چیزوں کا تعلق احکام شرعیہ سے نہ تھا، وہ چیزیں ان میں باقی رہ گئیں، مثلاً کائنات کی پیدائش کی ابتداء وغیرہ۔“

ابن خلدون کے اس کلام میں مصرح ہے کہ یہودیوں سے دریافت کرنے کا

قصہ اسلام سے پہلے کا ہے، اور یہ بھی مصرح ہے کہ یہودیوں کی صرف وہی باتیں ان مخصوص مسلمانوں میں رہ گئی تھیں، جن کا کوئی تعلق احکام شرعیہ سے نہ تھا، اور وہ ایسی باتیں تھیں کہ ان کے لئے احکام شرعیہ کی سی احتیاط کی ضرورت نہ تھی، اور یہ کہ ان باتوں پر وہی قائم رہے جنہوں نے پوچھا تھا، یہ نہیں کہ سب مسلمانوں نے ان کو تسلیم کرلیا، اور یہ کہ ابن خلدون نے یہ بات کتب تفسیر کے اسرائیلی اقوال کی نسبت لکھی ہے، مگر ''حق گو'' صاحب نے غایت ''دیانت داری'' سے اس کلام کو ''یہودیت و حدیث'' کے عنوان کے ماتحت درج کیا، اور ابن خلدون کے اس فقرہ ''فلما اسلموا بقوا علی ماکان عندھم مِمَّا له تعلق لا بالاحکام الشرعية التی یحتاطُونَ لَهَا مِثل اخبار بَدأ الخلیقة الخ'' کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ:

> ''جب مسلمان ہوئے تو جن باتوں کی احکام شریعت سے احتیاط کی جاتی تھی، تعلق نہ بنا، مثلاً ابتدائے خلق اور قرب قیامت کی نشانیاں اور فتن کی خبریں وہ سب ان کی وجہ سے مسلمانوں میں اب تک رہ گئیں۔''

حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ:

> ''جب وہ مسلمان ہوئے، تو وہ احکام شرعیہ جن کے لئے وہ احتیاط برتا کرتے تھے، ان سے جن باتوں کا تعلق نہ تھا، ان باتوں پر قائم رہ گئے۔''

حاصل کلام یہ کہ ابن خلدون کا یہ کلام حدیث کی نسبت نہیں ہے، بلکہ بعض تفسیروں کے اسرائیلی اقوال کی نسبت ہے اور وہ اقوال احکام شرعیہ سے متعلق نہیں ہیں، لہٰذا یہاں اس کلام کو پیش کرنا خیانت ہے، پھر یہ بھی سن لیجئے کہ ان اسرائیلی اقوال کو علمائے ملت نے قبول نہیں کیا، چنانچہ خود اسی مقدمہ میں آگے چل کر مصرح ہے، کہ پچھلے مفسرین نے تحقیق و تمحیص کر کے ان اقوال کو نکال ڈالا۔

یہود ونصاریٰ سے مسائل اخذ کرنے کی ممانعت حدیث میں

''حق گو'' صاحب نے مسلمانوں پر یہ الزام لگا تو دیا کہ انہوں نے یہود ونصاریٰ سے مسائل اخذ کئے، لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ اس کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے، اور نہ اس کے لئے کوئی تاریخی شہادت ہی ذکر کی، بلکہ آپ نے دیکھ لیا کہ انکا یہ الزام قرآن کے خلاف بلکہ ان غیر مسلموں کی تصریحات کے بھی خلاف ہے، جن کو ''حق گو'' صاحب بالکل معصوم تصور کرتے ہیں، اب میں ''حق گو'' صاحب کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ عقل سے ذرا کام لیتے، تو یہ الزام قائم کرنے کی ان کو جرأت نہ ہوتی، انہوں نے حدیث کا مطالعہ کیا ہوگا، تو ان کو معلوم ہوگا کہ متعدد احادیث میں یہود ونصاری سے اخذ مسائل کرنے کی ممانعت مصرح ہے، اور ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک سب حدیثیں بناوٹی ہیں، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ جب واضعین حدیث نے یہود ونصاری سے مسائل حاصل کئے اور ان کی پوری شریعت کو ایک نئے قالب میں ڈھال لیا، تو پھر انہوں نے یہ حدیثیں کیوں وضع کیں، یہ حدیثیں تو ان مقاصد کے لئے بے حد مضر ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ہم یہودیوں کی باتیں سنتے ہیں، تو ہم کو بہت بھلی لگتی ہیں اجازت دیجئے تو ہم ان کو لکھ لیں، آنحضرت ﷺ یہ سن کر بہت برہم ہوئے، اور فرمایا کہ ان کی طرح کیا تم کو بھی اپنی تشفی کے لئے غیروں کے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت ہے، حالانکہ میں تو جو شریعت لایا ہوں، وہ بالکل روشن اور صاف سیدھی ہے، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو میرے اتباع کے بغیر چارہ نہیں ہوتا مطلب یہ ہے کہ تم کو اپنے

نبی اور اپنی کتاب کے سوا کسی دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ''حق گو'' صاحب اس حدیث کو پڑھیں، اور بتائیں کہ یہ حدیث لوگوں نے کیوں ''وضع'' کی، اور اس کو ''وضع'' کر کے خواہ مخواہ اپنے پاؤں میں کیوں کلہاڑی ماری؟

اس مضمون کی اور حدیثیں بھی ہیں، منجملہ ان کے ایک وہ حدیث بھی ہے، جس کو ''حق گو'' صاحب نے (صفحہ ۱۲) میں نقل کیا ہے، کہ:

> ''اہل کتاب اپنی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر کے مسلمانوں کو عہد نبوی میں سنایا کرتے تھے، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی باتوں کو جھوٹی بھی نہ کہو لیکن اس کی تصدیق بھی نہ کرو۔''

''حق گو'' صاحب اس حدیث کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کو مدینہ کا نہیں، بلکہ شام کا واقعہ قرار دیتے ہیں، یعنی عہد نبوی کے بعد جب شام فتح ہوا ہے، لیکن سوال ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کہاں تھے، جو مذکورہ بالا حکم فرماتے؟ ''حق گو'' صاحب نے اس کو شام کا واقعہ اس لئے قرار دیا ہے کہ جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مدینہ آئے ہیں، اس وقت یہود مدینہ سے نکل چکے تھے، لیکن ''حق گو'' صاحب کا یہ استدلال غلط ہے، اس لئے کہ اس سے صرف یہ لازم آتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کا نہیں ہے، لیکن یہ کہتا کون ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کا ہے، واقعہ ان کے آنے سے پہلے کا ہے، لیکن جب وہ مدینہ میں آئے، تو ان سے کسی نے بیان کیا، انہوں نے اس بیان کی حکایت کر دی، اسی طرح صدہا واقعات انہوں نے بیان کئے ہیں، اور ہم کو تو ان باتوں سے کوئی بحث نہیں، ہم تو صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں، کہ اگر ''واضعین حدیث'' نے یہود و نصاری سے باتیں حاصل کی ہوتیں، تو اس حدیث کو ہرگز دفاتر حدیث میں جگہ نہ دیتے اس لئے کہ اس سے ان کو سخت نقصان پہنچتا ہے، اور ان کے فعل کی مذمت نکلتی ہے۔

''حق گو'' صاحب کی خبط الحواسی

''حق گو'' صاحب غایت بدحواسی کے عالم میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یہودیوں میں اولین فرائض وہی تھے، جو ہمارے ہاں ہیں، یعنی صلوٰۃ وصیام و زکوٰۃ، مگر جب مثنا کا رواج یہودیوں میں ہوا تو انہوں نے نمازیں اور روزے ضائع کر دیئے، اور زکوٰۃ کی جگہ سود لینے لگے، اور لگے قربانی اور سبت اور اس طرح کے طفلانہ احکام پر سختی سے عمل کرنے، اس لئے شام و عراق میں یہودیوں کے ساتھ بود و باش کرنے میں مسلمانوں نے انہی اعمال کی نقل کی جن کا اصل ماخذ مثنا تھا۔''

لیکن کیا ''حق گو'' صاحب ذرا اپنے حواس درست کر کے یہ بتا سکتے ہیں کہ حدیثوں میں سبت کی تعظیم اور ان کے احکام کا ذکر کس جگہ ہے، جو یہودیوں میں رائج تھے، اسی طرح قربانی کے احکام جو مثنا میں درج ہیں، اور یہودیوں کا ان پر عملدر آمد تھا، وہ حدیث یا فقہ میں کہا ہیں ''حق گو'' صاحب! آپ جھوٹ تو بولتے ہیں، لیکن آپ کو جھوٹ بولنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے، آپ اگر آنکھیں کھول کر دیکھتے تو آپ کو نظر آتا کہ حدیث و فقہ کی کتابوں میں سب سے پہلے پاکی اس کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ابواب نہایت جلی خط میں لکھے ہوئے ہیں، اور سبت و قربانی یہود کا کوئی ذکر نہیں ملتا، پس اگر مسلمانوں نے یہودیوں کے اعمال کی نقل کی ہوتی، تو اس کے برعکس ہوتا، اگر عقل ہو تو سوچئے کہ یہود نے نماز، روزہ کو بھلا دیا تھا، اور زکوٰۃ کی جگہ سود لینے لگے تھے، اور مسلمان بقول آپ کے انہی کے مقلد تھے، تو مسلمانوں نے کیوں اور کہاں سے نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی فرضیت اور اس کے مسائل کی تفصیل حدیث و فقہ میں لکھی، اور خواہ مخواہ کے لئے اتنے جھگڑے اپنے سر لئے؟ اور جواز سود، جیسے ''سود مند'' مسئلہ کو قبول کرنے کے بجائے اپنی کتابوں میں ''ابواب الربوا''

کے عنوانات قائم کر کے سود لینے کی ہزاروں برائیاں اور سودی لین دین کی صدہا صورتیں لکھ کر ان کو حرام قرار دے لیا اور وسائل معاش کو اپنے اوپر تنگ کر لیا بلکہ اگر آپ تتبع سے کام لیتے تو آپ کو حدیثوں میں صاف لکھا ہوا ملتا کہ سبت کے احکام یہود کے ساتھ مخصوص تھے، مسلمان ان احکامات کے مکلّف نہیں ہیں، بتائیے کہ جب واضعین حدیث یہود کے مقلد تھے، تو یہ حدیث انہوں نے کیوں وضع کی؟

تصویر کی حرمت وحلت کا مسئلہ

''حق گو'' صاحب نے تقلید یہود کی مثال میں تصویر بنانے کی حرمت کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ:

> ''تصاویر کے متعلق قرآن میں کوئی وعید نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف سلیمان کے تذکرہ میں وارد ہے۔ ''یَعْمَلُون لَہٗ ما یشاء مِنْ مَحَارِیْب و تمَاثیل'' البتہ مثنا میں ربیوں نے تصاویر کی سخت ممانعت کی ہے۔''

''حق گو'' صاحب کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں تو تصویر کی ممانعت ہے نہیں، لہٰذا مسلمانوں نے بہ تقلید یہود اس کی حرمت کی حدیثیں بنالیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس تقلید میں مسلمانوں کا کیا فائدہ تھا، تصویر کو حرام کرنے سے ان کو کس دنیاوی منفعت کی توقع تھی کہ انہوں نے بخیال ''حق گو'' صاحب قرآن کو چھوڑ کر یہودیوں کی پیروی کی، ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ انسان اپنا مذہب چھوڑ کر بلاوجہ اور بے غرض بے دینی اختیار نہیں کر سکتا، اور جب کہ ''حق گو'' صاحب کے خیال میں حکومتوں کی سرپرستی میں حدیث وضع کی گئی ہے، اور بادشاہ عموماً عیاش اور شہوت پرست تھے، تو اب تصویر کی حرمت صرف بے وجہ اور بے فائدہ ہی نہیں رہے گی، بلکہ بادشاہ وقت کی عیاشی اور شہوت پرستی کے لئے بے حد مضر بھی ہوگی۔ پس

تعجب ہے کہ ایسی چیز واضعین حدیث نے کیوں وضع کی اور بادشاہوں نے اس سے کیوں نہیں روکا، بالخصوص جب کہ وہ قرآن سے اس کا جواز دکھلا کر واضعین حدیث کے خلاف عوام الناس کے جذبات کو بھی برانگیختہ کر سکتے تھے، اور بزور اس کو روک سکتے تھے، پھر وہ واضعین حدیث بھی کیسے سادہ لوح تھے، کہ انہوں نے قرآن کو بھی چھوڑ دیا، اور اپنے محسنوں اور بادشاہوں کو بھی خوش نہ کر سکے، ''حق گو'' صاحب ہوش میں آؤ اور سوچو کہ ایسی بے عقلی کوئی انسان کیسے کر سکتا ہے، پھر ذرا یہ بھی بتاؤ، کہ جب تمہارے نزدیک گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی بات کے قرآن میں مذکور ہونے سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے، تو تم نے ڈاڑھی کے ان احکام پر جو احادیث میں مذکور ہیں، کیوں طعن کیا، اور اس کو یہودیوں کی تقلید کیوں کہا، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی کا ذکر قرآن میں موجود ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ داڑھی رکھنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، قرآن میں ہے کہ ''لا تاخذ بلحیتی ولا برأسی'' (یعنی) ''اے بھائی موسیٰ! میری داڑھی اور میرے سر کے بال نہ پکڑو'' اسی طرح قتل مرتد پر کیوں معترض ہوئے، جب کہ مرتدین بنی اسرائیل کی سزا قرآن میں قتل ہی مذکور ہے۔

''حق گو'' کی شرمناک غلط بیانی

اس کے بعد میں ''حق گو'' صاحب کی اس مشق دروغبافی کی داد دوں گا کہ انہوں نے نہایت دلیری سے یہ لکھ دیا کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے پر عقاب کی تصویر بنی ہوئی تھی۔''

کیوں صاحب آپ نے اس جھنڈے کو دیکھا ہے، اگر نہیں دیکھا ہے تو آپ کو کس کے بیان سے معلوم ہوا، اور اس کا بیان آپ تک کس طرح پہنچا، اور آپ نے اس سلسلۂ رواۃ پر کس طرح اعتبار کر لیا، جس کے ذریعہ آپ کو یہ معلوم ہوا ہے، کیا

آپ کو شرم نہیں معلوم ہوتی، کہ روایت کو آپ مردود بھی قرار دیتے ہیں؟ اور پھر اسی سے کام بھی لیتے ہیں۔

پھر اگر کسی روایت میں یہ ذکر ہوتا تو بھی غنیمت تھا، اور اس صورت میں آپ ایک ہی گناہ کے مرتکب ہوتے، (یعنی استدلال بالروایۃ کے) لیکن لطف تو یہ ہے کہ اس روایت ہی کا کہیں وجود نہیں ہے، سیر میں صرف اتنا ہے کہ آپ کے ایک جھنڈے کا نام "رایة العقاب" تھا، لیکن یہ کہ اس میں عقاب کی تصویر بنی تھی، "حق گو" صاحب کا اضافہ اور افتراء ہے، اس جھنڈے کا نام "رایة العقاب" اس لئے نہیں پڑا تھا کہ اس میں عقاب کی تصویر تھی، بلکہ وہ عقاب کی طرح بلندی میں اڑتا تھا، اور اس پر عقاب کا دھوکا ہوتا تھا، اس لئے "رایة العقاب" کہلاتا تھا، اور فتوح البلدان میں مورخ بلاذری نے لکھا ہے کہ عرب لوگ جھنڈے کو عقاب بھی کہتے ہیں۔

ماکول اللحم جانوروں کی بحث

"حق گو" صاحب لکھتے ہیں:

> "یہود میں کھانے پینے کی چیزوں میں بھی مذہب و ایمان کا دخل تھا، چنانچہ کتاب تثنیہ میں ماکولات لحم پر ایک بڑی لمبی فہرست دی گئی ہے، قرآن میں خدا نے فرمایا ہے کہ یہودیوں پر یہ حلال وحرام اس لئے تھا کہ اس سے زیادہ کی اہلیت مذہب میں نہ رکھتے تھے، مگر مسلمانوں نے جب یہودیوں کی فہرست دیکھی تو فوراً پنجہ دار جانوروں اور کیچلی دار جانوروں کی حرمت کی حدیث وضع ہوگئی۔"

"حق گو" کی قرآن مجید پر تعریض

"حق گو" صاحب نے اس عبارت میں قرآن مجید پر سخت تعریض کی ہے، ان

کے انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے پینے میں مذہب و ایمان کا دخل نہ ہونا چاہئے، حالانکہ قرآن کریم خود بہت سی چیزوں کو مذہباً حرام و ناجائز بناتا ہے، خدا فرماتا ہے "اُحِلّت لکُمْ بھیْمَة الانعامِ الا ما یتلٰی علیکُمْ" "(یعنی) تمہارے لئے سب چوپائے حلال کئے گئے ہیں، مگر وہ جن کی تلاوت آگے کی جائے گی۔" پھر اس اجمال کی تفصیل یوں کی گئی "حُرِّمت عَلَیکُمْ المیتة والدَّمُ وَلَحْمُ الخِنْزِیْرِ وما اُھِلَّ لِغَیْر اللّٰہِ بہٖ المنخنقة والموقوذة والمتردیة والنطیحة وَمَا اکلَ السَّبع الّا ما ذکیتم وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُب" "(یعنی) حرام کیا گیا تم پر مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ چیز جس پر غیر خدا کا نام پکارا گیا، اور جو جانور مرا ہو گلا گھٹنے سے اور چوٹ سے اور بلندی سے گر کر اور سینگ مارنے سے اور جس کو کھایا پھاڑنے والے جانور نے، مگر جو تم نے ذبح کر لیا ہو، اور (حرام ہے) جو ذبح کیا گیا ہو کسی تھان پر۔"

اس کے آگے اسی سورہ مائدہ میں شراب کی حرمت بھی مذکور ہے، اب "حق گو" صاحب بتائیں کہ مذہب و ایمان کا دخل کھانے پینے کی چیزوں میں بھی قرآن سے ثابت ہوا یا نہیں، اور انہوں نے منقولۂ بالا عبارت میں قرآن کے صریح احکام کی مخالفت و تکذیب کی یا نہیں؟ ناظرین "حق گو" صاحب کی اس عبارت کو پڑھیں، اور ہمارے اس قول کی تصدیق کریں، جس کو ہم نے مقدمہ میں لکھا ہے، کہ انکار حدیث کا منشاء بجز بے دینی اور مذہب سے آزادی حاصل کرنے کے اور کچھ نہیں۔

قرآن مجید پر افتراء

اس کے بعد ہم "حق گو" صاحب سے پوچھتے ہیں، کہ قرآن مجید میں یہ کہاں مذکور ہے کہ:

"یہود کے لئے یہ حلال و حرام اس لئے تھا کہ وہ اس سے زیادہ کی اہلیت

مذہب میں نہ رکھتے تھے۔"

مہربانی کر کے اس آیت کو نقل کیجئے جس میں فقدان اہلیت کا لفظ ہو، حیرت ہے کہ "حق گو" صاحب وضع حدیث کو تو جرم سمجھتے ہیں (اور حقیقۃً ایسا کرنے والا مجرم ہے) لیکن قرآن بنالینا اور خدا پر افتراء کر بیٹھنا، ان کے نزدیک کوئی جرم نہیں ہے؟

بنی اسرائیل پر طیبات کے حرام ہونے کی وجہ

قرآن میں جہاں اس کا ذکر ہے، وہاں کے الفاظ یہ ہیں: "فبظُلْمٍ مِنَ الَّذِيْنَ هَادوا حَرَّمْنا عَلَيْهِمْ طِيِّبٰت اُحِلَّت لَهُمْ وبصَدِّ هِمْ عَنْ سبيل الله كثيرًا" "(یعنی) یہودیوں کے ظلم و معصیت کی وجہ سے اور چونکہ وہ خدا کی راہ سے بہتوں کو روک رہے تھے، اس لئے ہم نے ان پر بہت سی پاکیزہ چیزوں کو حرام کر دیا۔" اور ایک جگہ ہے "ذٰلِك جزينٰهُمْ ببغيهمْ" "(یعنی) یہ ان کی سرکشی کا بدلہ تھا، بہرحال جب ان کی سرکشی کی وجہ سے بہت سی کھانے کی چیزیں ان پر خدا نے حرام کیں۔ تو ظاہر ہے کہ مذہب کو کھانے کی چیزوں میں دخل ہوا۔

'حق گو' نسخ کا قائل ہو گیا

یہاں پر "حق گو' صاحب کو ایک نکتہ سمجھا دینا مناسب ہوگا، "حق گو' صاحب اقراری ہیں کہ یہودیوں پر بہت سی کھانے کی چیزیں اللہ نے حرام کیں، اور یہ تحریم ان کی نا اہلیت کی وجہ سے تھی، اور "حق گو' صاحب اس کا بھی انکار نہیں کر سکتے، بلکہ ان کا عنوان کلام اس کو صاف ظاہر کر رہا ہے کہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ میں وہ چیزیں حرام نہیں ہیں، پس ثابت ہوا کہ ایک چیز کو اللہ تعالیٰ ایک وقت میں کسی مصلحت سے حرام کرتا ہے، اور پھر اسی کو حلال کر دیتا ہے، اور اسی کا نام ہماری اصطلاح میں نسخ ہے، پس "حق گو' صاحب خود اپنے اقرار سے نسخ کے قائل ہو گئے، لہٰذا ان کا اس مسئلہ پر طعن کرنا ان کی خبط الحواسی کی دلیل ہے۔

صلی اللّٰہ علیه وسل لا یزید ولا ینقص فقد اخطأ."[1]

تَرجَمَہ: "یعنی جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے تراویح کے باب میں کوئی معین عدد ثابت ہے جو کم و بیش نہیں ہوسکتا وہ غلطی پر ہے۔"

اور سبکی شرح منہاج میں لکھتے ہیں "اعلم انه لم ینقل کم صلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فی تلك اللیالی هل هو عشرون او اقل[2]" یعنی یہ منقول نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان راتوں میں کتنی رکعتیں پڑھیں، بیس یا کم اور سیوطی مصابیح میں لکھتے ہیں "ان العلماء اختلفوا فی عددها ولو ثبت ذلك من فعل النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم لم یختلف فیه صفحه ٤٤" یعنی علماء کا تراویح کے عدد میں اختلاف ہے، اگر آنحضرت ﷺ کے فعل سے کوئی عدد ثابت ہوتا تو اختلاف نہیں ہوسکتا تھا۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امام شافعی نے فرمایا ہے "لیس فی ذلك ضیق ولا حد ینتهی الیه" یعنی اس میں کوئی تنگی نہیں ہے، نہ رکعات کی کوئی خاص حد ہے، کہ اس پر آکر رک جانا چاہئے امام شافعی کے اس قول کو نووی نے بیہقی کی معرفة السنن سے نقل کیا ہے اور قیام اللیل میں (بھی) مذکور ہے۔

علامہ شوکانی نیل الاوطار میں فرماتے ہیں "والحاصل الذی دلت علیه احادیث الباب وما یشابهها هو مشروعیة القیام فی رمضان والصلوة فیه جماعة وفرادیٰ فقصر الصلوة المسماة بالتراویح علی عدد معین و تخصیصها بقراء ة مخصوصة لم ترد به سنة" یعنی اس باب کی حدیثوں اور ان کے مشابہ حدیثوں کا حاصل اتنا ہے کہ رمضان میں قیام

---

[1] مرقاة والانتقاد الرجیح: ص ٦٣

[2] تحفة الاخیار: ص ١٦ و مصابیح: ص ٤٤

اور اکیلے یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا مشروع ہے، پس تراویح کو کسی خاص عدد میں منحصر کر دینا اور اس میں خاص مقدار قراءت مقرر کرنا ایسی بات ہے جو سنت میں وارد نہیں ہوئی۔

علماء کی ایک جماعت کی تو یہ تحقیق ہے لہٰذا اس جماعت کی تحقیق میں وہ تمام روایات جو آنحضرت ﷺ کی تراویح کا معین عدد بتانے کے لئے پیش کی جاتی ہیں، خواہ آٹھ ہوں یا بیس وہ سب روایتیں صحیح نہیں ہیں، یا غیر متعلق ہیں، یعنی ان میں تراویح کا نہیں بلکہ کسی دوسری نماز کا عدد بتایا گیا ہے۔

علماء کا دوسرا گروہ وہ ہے جو مانتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے عدد معین ثابت ہے جیسے فقہائے احناف میں قاضی خاں وطحاوی غیرہ اور شوافع میں رافعی وغیرہ کہ یہ لوگ آنحضرت ﷺ سے بیس کا عدد ثابت مانتے ہیں۔

اس گزارش کے بعد اب ہم اہل حدیث کے پہلے دعویٰ کو لیتے ہیں۔

اہل حدیث کا پہلا دعویٰ

اہل حدیث نے اپنے پہلے دعویٰ کے ثبوت میں دو دلیلیں پیش کی ہیں۔

① پہلی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث ہے جو صحیح بخاری میں بایں الفاظ مروی ہے ”ما كان يزيد في رمضان ولا في غيره على احدى عشرة ركعة“، یعنی آنحضرت ﷺ رمضان وغیرہ رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔

جواب: اہل حدیث کا یہ استدلال بالکل بے محل ہے، اور کسی طرح مثبت مدعا نہیں۔

اولاً: اس لئے کہ گفتگو تراویح کی رکعات میں ہے اور تراویح کی تعریف حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں یوں ذکر کی ہے ”الصلوة في الجماعة في ليالي

رمضان التراویح"[1]

یعنی جو نماز جماعت کے ساتھ رمضان کی راتوں میں پڑھی جاتی ہے، اس کا نام تراویح ہے اور حافظ عبداللہ صاحب ضمیمہ رکعات التراویح میں لکھتے ہیں نماز تراویح وہ نماز ہے جو ماہ مبارک رمضان کی راتوں میں عشاء کے بعد باجماعت پڑھی جائے اور یہ قسطلانی (جلد۳ صفحہ۴۸۳) میں بھی مذکور ہے، پس جب تراویح خاص رمضان کی نماز ہے، اور حدیث عائشہ میں اس نماز کا ذکر ہے جو غیر رمضان میں بھی پڑھی جاتی تھی، تو اس کو تراویح اور اہل حدیث کے مدعا سے کیا تعلق؟

اس بات کی تائید کہ اس حدیث کا تعلق تراویح سے نہیں ہے اس سے بھی ہوتی ہے، کہ حافظ ابن حجر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس بیان کو تہجد سے متعلق قرار دے کر تہجد مع وتر کی رکعتوں کے گیارہ ہونے کی حکمت یہ ذکر کی ہے کہ تہجد اور وتر رات کی مخصوص نمازیں ہیں، اور دن کی فرض نمازیں تین ہیں، چار رکعت ظہر، چار رکعت عصر، اور تین رکعت مغرب، یہ کل گیارہ رکعتیں ہوئیں تو مناسب ہوا کہ رات کی نمازیں بھی اجمال و تفصیل دونوں میں دن کے مشابہ ہوں یعنی ان کی مجموعی تعداد بھی گیارہ ہو، اور تفصیلی طور پر رات میں بھی پہلے چار رکعتیں نفل کی، پھر چار رکعتیں نفل کی، پھر تین رکعتیں وتر کی ہوں، دیکھو فتح الباری (جلد۳ صفحہ۱۴) میں حافظ ابن حجر کی وہ عبارت جو یوں شروع ہوتی ہے "وظهر لی ان الحکمة فی عدم الزیادة علی احدی عشرة ان التهجد والوتر مختص بصلاة اللیل"

میرا مقصد یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کی اس تقریر سے بھی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کا تہجد کے باب میں ہونا ثابت ہے، اور اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ علامہ ابن تیمیہ اور علامہ شوکانی وغیرہما کی تصریح آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ تراویح کا کوئی عدد معین آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں ہے اور تراویح کو کسی خاص عدد میں

---

[1] فتح الباری: ١٧٨/٤

منحصر کرنا مثلاً یہ کہنا کہ تراویح کی گیارہ ہی رکعتیں سنت ہیں، یا تیرہ ہی رکعتیں سنت ہیں، اور تیرہ یا گیارہ پر زیادتی خلاف سنت ہے ابن تیمیہ کے الفاظ میں خطا ہے، اور شوکانی کے الفاظ میں یہ ایسی بات ہے جس کا ثبوت کسی حدیث میں نہیں ہے۔

پس ان حضرات کے نزدیک بھی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں تراویح کی رکعات کا بیان نہیں ہے اور اگر ہے تو ان کے نزدیک اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ گیارہ سے زیادہ پڑھنا خلاف سنت ہے اس لئے کہ اگر یہ مطلب ہو تو یہ خود ان کی کہی ہوئی بات کے خلاف ہوگا اور عقلاء کے کلام میں ایسا تناقض نہیں ہوتا۔

ثانیاً: اگر بالفرض اس حدیث کا تعلق تراایح ہی سے ہو تو بھی اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ آنحضرت ﷺ نے گیارہ سے زیادہ تراویح نہیں پڑھی، اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دوسری صحیح روایت میں یہ بھی فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ تیرہ رکعت پڑھتے تھے۔[1]

حافظ ابن حجر وغیرہ شراح حدیث نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ان دونوں مختلف بیانات میں یوں تطبیق دی کہ یہ بیانات مختلف حالات اور اوقات سے تعلق رکھتے ہیں یعنی یہ کہ کسی کسی یا اکثر حالات واوقات میں گیارہ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اور کبھی کبھی تیرہ بھی پڑھ لیتے تھے حافظ لکھتے ہیں "والصواب ان كل شی ذکرته من ذلك محمول علی اوقات متعددة واحوال مختلفة"[2]

اسی لئے حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کو بھی ماننا پڑا کہ حق یہ ہے کہ آپ نے کبھی کبھی سنت فجر کے علاوہ بھی تیرہ رکعتیں پڑھی ہیں۔[3]

اور مولانا عبدالرحمٰن نے بھی تسلیم کیا کہ "انه قد ثبت ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان قد یصلی ثلث عشرة رکعة سوی رکعتی الفجر التحفة الاحوذی"[4]

---

[1] بخاری [2] ۱۴/۳ [3] رکعات التراویح: ص ۵ [4] ۷۳/۲

یعنی یہ ثابت و محقق ہو چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی کبھی تیرہ رکعت فجر کی سنتوں کے سوا پڑھتے تھے پس جب گیارہ سے زیادہ پڑھنا ثابت و محقق ہے تو اہل حدیث کا یہ دعویٰ کہ رسول اللہ ﷺ کا مع وتر گیارہ رکعت سے زیادہ پڑھنا ثابت نہیں، جیسا کہ حافظ عبداللہ صاحب نے رکعات تراویح میں لکھا ہے باطل ہو گیا۔

اور جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں باقرار اہل حدیث رمضان و غیر رمضان کی تمام راتوں کا حال مذکور نہیں، بلکہ بعض یا اکثر کا تو اہل حدیث کا اپنے مدعا کے ثبوت میں اس کو پیش کرنا نادانی یا تجاہل ہے۔

نیز جب اس حدیث میں تمام راتوں کا ذکر نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ اکثر راتوں کا ذکر مذکور ہے تو اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ بعض راتوں میں حضرت نے گیارہ سے زیادہ رکعتیں بھی پڑھیں ہیں......... اور اس کے ثبوت میں کوئی حدیث پیش کرے تو اس حدیث کو حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے معارض و مخالف قرار دینا سخت بھول اور غفلت پر مبنی ہے اس لئے کہ ان دونوں باتوں میں قطعاً کوئی تضاد و تخالف نہیں کہ ① آنحضرت ﷺ اکثر راتوں میں گیارہ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ ② اور بعض راتوں میں آپ نے گیارہ سے زیادہ پڑھی ہیں جس طرح اس میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ زید اکثر راتوں میں چھ گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتا اور بعض راتوں میں وہ سات گھنٹے تک سوتا رہا ہے، کون نہیں جانتا کہ تناقض کے لئے وحدت زمان شرط ہے۔

ثالثاً: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا پہلا فقرہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ رمضان و غیر رمضان میں گیارہ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، ذرا مبہم ہے، اس سے صاف نہیں ہوتا، کہ آپ سات پڑھتے تھے، یا نو یا گیارہ اسی طرح یہ صاف نہیں ہوتا کہ وتر کی ایک رکعت پڑھتے تھے یا تین، یا تین سے زیادہ، اس لئے کہ ان صورتوں میں سے جو صورت بھی رہی ہو، اس پر صادق ہے کہ گیارہ سے زیادہ نہیں پڑھتے

تھے، مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دوسرے فقرہ میں اس ابہام کو دور کر کے ایک صورت متعین فرما دی ہے، فرماتی ہیں ”یصلی اربعا فلا تسأل عن حسنهن وطولهن ثم یصلی اربعا فلا تسال عن حسنهن وطولهن ثم یصلی ثلاثا“ یعنی آنحضرت ﷺ پہلے چار رکعتیں ایسی پڑھتے تھے، پھر تین رکعتیں ایسی پڑھتے تھے کہ ان کے حسن وطول کو نہ پوچھو اس کے بعد پھر ایسی ہی چار رکعتیں پڑھتے تھے، پھر تین رکعتیں پڑھتے تھے۔

اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گیارہ سے زیادہ نہ پڑھنے کی یہ صورت متعین کر دی ہے کہ نہ سات نہ نو، بلکہ گیارہ پڑھتے تھے، اور یہ کہ وتر کی تین رکعتیں پڑھتے تھے، اسی کے ساتھ یہ بھی سن لیجئے کہ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی میں اس بات کو بھی صاف کر دیا ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ یہ پہلی چار رکعتیں ایک ایک سلام سے اور پچھلی تین رکعتیں ایک سلام سے تھیں۔[1]

اس تمہید کے بعد اب ہماری گزارش یہ ہے کہ جب حدیث کے پہلے فقرہ سے اہل حدیث کے خیال میں آنحضرت ﷺ کا دائمی معمول یہ ثابت ہوگا کہ آپ گیارہ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، تو دوسرے فقرہ سے جس میں پہلے ہی فقرہ کی توضیح وتشریح کی گئی ہے، یہ ثابت ہوا کہ آپ کا دائمی معمول گیارہ پڑھنے کا اس طرح تھا کہ پہلے چار چار رکعتیں ایک ایک سلام سے پڑھتے تھے، پھر وتر کی تین رکعتیں ایک سلام سے پڑھتے تھے۔ لہٰذا اہل حدیث کو لازم تھا کہ وہ کبھی گیارہ رکعت سے کم تراویح نہ پڑھتے، اور ہمیشہ چار چار رکعتوں پر سلام پھیرتے اور ہمیشہ وتر کی تین رکعتیں ایک سلام سے پڑھتے، مگر اہل حدیث ایسا نہیں کرتے، بلکہ عموماً نو رکعتیں پڑھتے ہیں جیسا کہ ہمارے بلاد کے ہزاروں آدمی جانتے ہیں، پھر ہمیشہ دو رکعتوں پر سلام پھرتے ہیں، اور جہاں تک معلوم ہے غیر رمضان میں ہمیشہ وتر کی ایک رکعت پڑھتے ہیں اور

---

[1] تحفة الاحوذی: ۳۳۱/۱

اگر کوئی تین پڑھ بھی لیتا ہے تو دو سلام سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خود اہل حدیث کے نزدیک یہ حدیث لازم العمل نہیں ہے، نہ اس کی خلاف ورزی سنت کی خلاف ورزی ہے، ایسی حالت میں دوسروں پر اس سے حجت قائم کرنا یا کسی دعوے کے ثبوت میں اس کو پیش کرنا بالکل خلاف انصاف و دیانت ہے اور اگر ہماری اس گرفت سے گھبرا کر اہل حدیث یہ کہنے لگیں کہ اس حدیث میں دوامی کیفیت کا بیان نہیں ہے تو گزارش ہے کہ دوامی نہیں تو اکثری تو ہے اور اہل حدیث کا عمل اکثر اوقات میں بھی اس کے مطابق نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف ہے۔

رابعاً: امام محمد بن نصر مروزی نے اپنی کتاب قیام اللیل میں ایک باب کا عنوان یہ قرار دیا ہے "باب عدد الرکعات التی یقوم بها الامام للناس فی رمضان" یعنی ان رکعتوں کی تعداد کا باب جو امام لوگوں کے ساتھ رمضان میں پڑھے گا اس باب میں وہ رکعات تراویح کی تعداد بتانے کے لئے بہت سی روایتیں لائے ہیں مگر حضرت عائشہ کی اس حدیث کو جو سب سے صحیح اور اعلیٰ درجہ کی ہے ذکر کرنا تو درکنار اشارہ تک نہیں کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے علم و تحقیق میں بھی اس حدیث کا کوئی تعلق تراویح سے نہیں ہے۔

ایک شبہہ کا ازالہ

اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ تہجد اور تراویح میں کوئی فرق نہیں ہے، نماز ایک ہے نام دو ہیں اسی کو گیارہ مہینے تہجد کہتے ہیں اور اسی کو رمضان میں تراویح کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

تو سوال ہے کہ اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے؟ اور جب کہ ان دونوں میں متعدد وجوہ مغائرت کے موجود ہیں، تو ان دونوں کو ایک کہنا کیوں کر ممکن ہے؟

مغائرت (دونوں کے دو ہونے) کے وجوہ متعدد ہیں مثلاً ایک وجہ یہ ہے کہ تہجد کی مشروعیت بنص قرآنی ہوئی ہے ”فتهجد به نافلة“ اور ”قم الليل الا قليلا“ وغیرہ کی تفسیر دیکھئے اور تراویح کی مسنونیت احادیث سے ہوئی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”سننت لكم قيامه“[1] (نسائی) یعنی میں نے رمضان کے قیام کو مسنون کیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تہجد کی رکعات بالاتفاق رسول اللہ ﷺ سے منقول و ماثور ہیں، اور وہ زیادہ سے زیادہ مع الوتر تیرہ اور کم سے کم سات مع الوتر ہیں، جیسا کہ ترمذی اور اس کی شرح ”تحفة الاحوذى“ (جلد۱صفحہ۳۳۳) میں ہے برخلاف تراویح کے کہ اس کا کوئی معین عدد علامہ ابن تیمیہ وغیرہ کی تصریح کے بموجب آنحضرت ﷺ سے منقول نہیں ہے اسی طرح تہجد کی رکعتیں بالاتفاق ائمہ کے نزدیک وتر کے ساتھ سات سے تیرہ تک ہیں اور تراویح کی رکعات میں ان کا اختلاف ہے، کوئی بیس کہتا ہے اور کوئی چھتیس، بلکہ ائمہ اربعہ کے ساتھ دوسرے ائمہ اسلام کو بھی شامل کر لیجئے، تو تراویح کا عدد وتر کو لے کر سینتالیس تک پہنچ جاتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ امام بخاری کا عمل بتاتا ہے کہ وہ دونوں کو علیحدہ علیحدہ سمجھتے تھے، ان کا معمول تھا کہ رات کے ابتدائی حصہ میں اپنے شاگردوں کو لے کر باجماعت نماز پڑھتے تھے اور اس میں ایک ختم کرتے تھے، اور سحر کے وقت اکیلے پڑھتے تھے، اور ہر تیسرے دن ایک ختم کرتے تھے، اسی طرح حنفی فقہ نہیں بلکہ غیر حنفی

---

[1] ایک دوسری حدیث میں جو آیا ہے ”جعل الله صيامه فريضة وقيامه تطوعا“ (یعنی اللہ نے اس کے روزے کو فرض اور قیام کو تطوع بنایا ہے) تو یہ بھی صحیح ہے اس لئے کہ شارع حقیقی حق تعالیٰ ہے اور ہر شرعی حکم کا دینے والا وہی ہے اس کی مرضی کے بغیر آنحضرت ﷺ بھی کوئی حکم نہیں دے سکتے، اسی لئے اس حدیث میں قیام رضان کو تطوع بنانے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اور چونکہ وہ حکم حق تعالیٰ ...... نے نص قرآنی کے ذریعہ نہیں دیا، بلکہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے آپ کے الفاظ میں اس کی تشریح ہوئی، اس لئے دوسری حدیث میں ارشاد ہوا کہ میں نے مسنون کیا (۱۲ منہ)۔

فقہ کی جزئیات سے بھی دونوں کی مغائرت ثابت ہوتی ہے، چنانچہ حنبلی مذہب کی فقہی کتاب مقنع میں ہے ”ثم التراویح وھی عشرون رکعة یقوم بھا فی رمضان فی جماعة ویوتر بعدھا فی الجماعة فان کان له تھجد جعل الوتر بعده“[1]

یعنی پھر تراویح ہے کہ اس کو رمضان میں باجماعت پڑھے اور اس کے بعد باجماعت وتر پڑھے اور اگر وہ تہجد بھی پڑھتا ہو تو وتر تراویح کے بعد نہیں بلکہ تہجد کے بعد پڑھے، اور یہ تنہا مقنع کے مصنف کا فتویٰ نہیں ہے، بلکہ آگے جو مسئلہ مذکور ہے اس سے ثابت ہے، کہ امام احمد بھی تراویح اور تہجد کو دو قرار دیتے تھے، اور ایک کا اول شب میں اور دوسری کا آخری شب پڑھنا جائز سمجھتے تھے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جو تہجد اور تراویح دونوں پڑھتا ہے، یہ چاہے کہ تراویح کے بعد امام کے ساتھ وتر میں بھی شریک ہو جائے تو امام احمد کے نزدیک اس کو یہ چاہئے کہ امام جب سلام پھیرے تو یہ کھڑا ہو جائے اور مزید ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیرے تاکہ ایک رات میں دو وتر پڑھنا لازم نہ آئے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پوتے نے مقنع کے حاشیہ میں اپنے قلم سے لکھا ہے کہ یہ مسئلہ منصوص ہے، یعنی امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے۔[2]

تراویح اور تہجد میں مغائرت کے وجوہ اور بھی ہیں لیکن بنظر اختصار انہی تین وجہوں پر اکتفاء کرتا ہوں، اور اب خاص احناف کے اطمینان کے لئے عرض کرتا ہوں کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بھی دونوں میں مغائرت کے قائل ہیں، اور ہر ایک کو دوسرے سے الگ نماز مانتے ہیں، حضرت گنگوہی نے بہت شرح وبسط کے ساتھ کئی اوراق میں نہایت مدلل طور پر دونوں کا جداگانہ نماز ہونا ثابت کیا ہے، اور مغائرت کی بہت سی وجہیں

---

[1] مقنع: ۱/۱۸۴ [2] ص ۲۵

ذکر کی ہیں، ان میں سے پہلی وجہ ہم نے بھی پہلے نمبر پر ذکر کی ہے، ازاں جملہ حضرت طلق بن علی کے عمل سے دونوں کا دو ہونا ثابت کیا ہے اور سنن ابی داؤد سے ان کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اول شب میں تراویح اور آخر میں تہجد پڑھتے تھے غرض ان تمام وجوہ مذکورہ کی بنا پر ان کی تحقیق یہ ہے کہ ”نماز تہجد اور نماز تراویح ہر دو صلوٰۃ جداگانہ ہیں۔“[1]

اور حضرت نانوتوی نے الحق الصریح (صفحہ ۴) میں دونوں کے الگ الگ ہونے کو موجہ قرار دیا ہے۔

اہل حدیث کے پہلے دعویٰ کی دوسری دلیل

اہل حدیث دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ، قیام اللیل اور معجم صغیر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”صلی بنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی شھر رمضان ثمان رکعات واوتر“ یعنی آنحضرت ﷺ نے رمضان میں ہمارے ساتھ آٹھ رکعتیں اور وتر پڑھیں۔

اس کے متعلق سب سے پہلے یہ جان لیجئے کہ یہ واقعہ فقط ایک رات کا ہے، اس لئے کہ اس روایت میں آگے یہ مذکور ہے کہ جب دوسری رات میں صحابہ مجتمع ہوئے تو آنحضرت ﷺ حجرہ سے برآمد نہیں ہوئے اور میزان الاعتدال میں ”لیلۃ“ ایک رات کی تصریح بھی موجود ہے۔

دوسری بات یہ معلوم کر لیجئے کہ رمضان میں آنحضرت ﷺ کے مسجد میں نماز پڑھنے اور آپ کے ساتھ صحابہ کے شریک ہونے کا ایک واقعہ تو وہ ہے جو صحیحین وغیرہ میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا منقول ہے، اس میں تین راتوں میں پڑھنا اور چوتھی رات میں حجرہ سے برآمد نہ ہونا مذکور ہے۔

دوسرا واقعہ وہ ہے جو بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ مسلم میں مذکور ہے، اور اس کی

---

[1] الرای النجح: ص ۲

نسبت حافظ ابن حجر نے لکھا ہے "والظاھر ان ھذا کان فی قصة اخری" یعنی ظاہر یہ ہے کہ یہ دوسرے قصہ میں ہوا ہے۔[1]

تیسری روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ہے جو اس وقت زیر بحث ہے اس کی نسبت یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی واقعہ ہے جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے اس لئے کہ جابر کے بیان میں صرف ایک رات نماز پڑھنا اور دوسری رات میں نہ آنا مذکور ہے، اسی لئے حافظ ابن حجر نے ان دونوں واقعوں کے ایک ہونے میں تردد کا اظہار کیا ہے۔[2]

چوتھی روایت حضرت ابوذر کی ہے جس میں نے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سال رمضان کی تیسویں پچیسویں اور ستائیسویں رات میں مسجد کے اندر باجماعت تراویح پڑھنا بیان کیا ہے، یہ روایت ترمذی وابوداؤد وغیرہ میں ہے۔

پانچویں روایت زید بن ثابت کی ہے، جس میں رمضان کی تصریح نہیں ہے، مگر ظاہر یہی ہے کہ وہ بھی رمضان ہی کا واقعہ ہے۔

چھٹی روایت حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی ہے کہ ہم نے رمضان کی تیئسویں رات میں آدھی رات تک قیام کیا، پھر ستائیسویں کو قیام کیا، تو ہم کو اندیشہ ہوا کہ آج سحری نہ کھا سکیں گے ان کے علاوہ اور روایتیں بھی ہیں، غرض رمضان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز باجماعت کو بہت سے صحابہ بیان کرتے ہیں، مگر ان صحابیوں کے شاگردوں اور راویوں میں سے کوئی ایک شاگرد یا راوی ان صحابیوں سے ان رکعات کی تعداد نقل نہیں کرتا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان راتوں میں پڑھی تھیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ان کی حدیث کا روایت کرنے والا صرف ایک شخص ہے اور وہی ایک شخص حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ان رکعات کی تعداد نقل کرتا ہے۔

لہٰذا ویسے تو ہر حدیث کی اسناد میں نظر کرنا اور اس کے رجال کے حالات معلوم

---

[1] فتح الباری: ۸/۳

[2] فتح الباری: ۸/۳

کر کے دیکھنا کہ یہ اسناد قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ محدثین کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے لیکن اس حالت میں کہ نماز تراویح باجماعت کے واقعہ یا واقعات کے ناقل کئی صحابیوں کے شاگرد ہیں اور ان میں کوئی بھی رکعات کا ذکر نہیں کرتا، بس ضروری ہو جاتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے راوی کا حال معلوم کیا جائے، جو تنہا رکعات کا ذکر کرتا ہے، اس لئے میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے راوی عیسیٰ بن جاریہ کے متعلق رجال کی کتابوں سے ناقدین رجال کی تصریحات پیش کرتا ہوں تاکہ یہ فیصلہ ہو سکے کہ اس کی روایت ازروئے فن حدیث قابل اعتماد ہے، یا نہیں؟ عیسیٰ بن جاریہ کا حال اس راوی کا ذکر حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجر نے تہذیب وغیرہ میں کیا ہے، اور لکھا ہے کہ امام فن جرح وتعدیل یحییٰ بن معین نے اس کی نسبت لکھا ہے "لیس بذاك" وہ قوی نہیں ہے، اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اس کے پاس منکر روایتیں ہیں، اور امام نسائی، وامام ابوداؤد نے کہا ہے وہ منکر الحدیث ہے امام نسائی نے اس کو متروک بھی کہا ہے، اور ساجی وعقیلی نے اس کو ضعفاء میں ذکر کیا ہے اور ابن عدی نے کہا ہے کہ اس کی حدیثیں محفوظ نہیں ہیں۔ (یعنی شاذ ومنکر ہیں)۔

یہ سات حضرات ہیں جنہوں نے عیسیٰ پر جرح کی ہے، اور ان کے مقابل میں صرف ایک امام ابوذرعہ ہیں جنہوں نے عیسیٰ کو "لا باس به" (اس میں کوئی مضائقہ نہیں) کہا، اور دوسرے ابن حبان ہیں جنہوں نے اس کو ثقاہت میں ذکر کیا ہے اور اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ جرح مفسر تعدیل پر مقدم ہوتی ہے، لہٰذا عیسیٰ اصولاً مجروح قرار پائے گا، بالخصوص جب کہ عیسیٰ پر جو جرحیں کی گئی ہیں وہ بہت سخت ہیں، چنانچہ امام نسائی وابوداؤد نے اس کو منکر الحدیث لکھا ہے اور مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے "ابکار المنن" میں سخاوی کے حوالہ سے بغیر رد وکد کے یہ لکھا ہے "منكر الحديث وصف فى الرجل يستحق به الترك لحديثه"[1]

---

[1] بکار المنن: ص ۱۹۱

یعنی منکر الحدیث ہونا آدمی کا ایسا وصف ہے کہ وہ اس کی وجہ سے اس بات کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس کی حدیث ترک کر دی جائے (اس سے حجت نہ پکڑی جائے اور قبول نہ کی جائے)۔

اس تصریح کے بموجب از روئے اصل عیسیٰ کی یہ روایت قابل قبول نہیں ہو سکتی بالخصوص جب کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس بات کو نقل کرنے میں وہ منفرد ہے، دوسرا کوئی اس کا موید و متابع موجود نہیں ہے نہ کسی دوسرے صحابی کی حدیث اس کی شاہد ہے جابر سے روایت کرنے میں اس کے منفرد ہونے کی دلیل تو یہ ہے کہ امام طبرانی نے عیسیٰ کی یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے ”لا یروی عن جابر بن عبداللّٰه الا بهذا الاسناد“ یعنی حضرت جابر سے بجز اس سند کے کسی دوسری سند سے یہ حدیث مروی نہیں ہے اور کسی دوسرے صحابی کی حدیث سے اس کی تائید نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ دوسرے صحابہ میں اس واقعہ کو نقل کرنے والے ایک ابوذر ہیں، ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حافظ ابن حجر کی تصریح کے بموجب حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے کسی طریق میں اور مولانا عبدالرحمٰن کے اقرار کے بموجب حدیث ابوذر کے کسی طریق میں رکعات کی تعداد کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور باقی روایات کا بھی یہی حال ہے اگر کوئی اس کے خلاف مدعی ہو تو ثبوت پیش کرے۔

اور یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبی نے عیسیٰ کے تذکرہ میں اس کی اس روایت کو میزان الاعتدال میں نقل کیا ہے، ان کی عادت ہے کہ وہ اس کتاب میں جس مجروح راوی کا ذکر کرتے ہیں اگر اس کی روایات میں کوئی منکر روایت ہوتی ہے تو وہ اس منکر روایت کو بھی ذکر کرتے ہیں۔

اصل میں یہ طرز ابن عدی کا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب کامل میں اختیار کیا ہے انہی کا طرز حافظ ذہبی نے اختیار کیا ہے۔ اس پر اگر یہ شبہہ کیا جائے کہ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اس کو ذکر کرنے کے بعد اس کی اسناد کو متوسط درجہ کی

اسناد قرار دیا ہے لہٰذا میزان میں ذکر کرنے سے اس حدیث کا ضعیف و منکر ہونا ثابت نہ ہوگا نہ یہ لازم آئے گا کہ انہوں نے اس کو ضعیف و منکر سمجھ کر نقل کیا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولا مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے ''ابکار المنن'' میں ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات میں نہایت زور وشور سے یہ لکھا ہے کہ سند کے صحیح یا حسن ہونے سے حدیث کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا، ہوسکتا ہے کہ اور صرف ہو ہی نہیں سکتا بلکہ واقع ہے کہ ایک حدیث کی سند بالکل کھری ہو لیکن اس کا متن (یعنی مضمون) کسی دوسری علت کی بنا پر قطعاً صحیح و ثابت نہ ہو تو جب اسناد کے صحیح ہونے سے حدیث کا صحیح و حسن ہونا لازم نہیں آتا، تو فقط متوسط درجہ کی اسناد ہونے سے حدیث کا صحیح و حسن ہونا کیونکر لازم آئے گا دیکھئے مولانا عبدالرحمٰن صاحب ابکار المنن (صفحہ ۲۰) میں فرماتے ہیں ''سلمنا صحة اسناده لكن قد تقدر ان صحة الاسناد لا تستلزم صحة المتن'' یعنی ہم کو اسناد کا صحیح ہونا مسلم ہے، مگر ثابت ہو چکا ہے کہ اسناد کے صحیح ہونے سے متن کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا، اور (صفحہ ۶۴) میں ایک حدیث کی نسبت جس کی اسناد کو حافظ ابن حجر نے حسن قرار دیا ہے لکھتے ہیں ''مقصود الحافظ ان اسناد حديث عمار فى الضربتين حسن و الحديث ضعيف لما ذكر ومن المعلوم ان حسن الا سناد او صحته لا يستلزم حسن الحديث اوصحته'' یعنی حافظ ابن حجر کا مقصود یہ ہے کہ ضربتین کے باب میں عمار کی حدیث کی سند حسن ہے، لیکن حدیث ضعیف ہے، اس سبب سے کہ ذکر کیا، اور معلوم ہے کہ اسناد کے حسن یا صحیح ہونے سے لازمی طور پر حدیث حسن یا صحیح نہیں ہو جاتی۔

اور (صفحہ ۴۹) میں ایک حدیث کے باب میں جس کے سب رجال کو ہیثمی نے ثقہ کہا ہے فرماتے ہیں ''كون رجال الحديث ثقاتا لا يستلزم صحته'' یعنی رجال حدیث کے ثقہ و معتبر ہونے سے حدیث کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔